جواہرات



جواہرات

جواہر لال نہرو کو کشمیر کا نذرانۂ عقیدت

کمال احمد صدیقی

ادارۂ ادبیات سرینگر کشمیر

پہلی بار : ایک ہزار
قیمت : پانچ روپے

ملنے کے پتے
(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دِلّی
(۲) ادارۂ ادبیات ۱۸ ریزیڈنسی روڈ سرینگر (کشمیر)

"یہ تھا وہ شخص، جس نے اپنے دِل کی گہرائیوں سے ہندوستان اور ہندوستان کے عوام کو چاہا اور اس کے عوض اُسے ہندوستان کے لوگوں کی بے پایاں محبّت مِلی اور وہ اس پر جان چھڑکتے تھے۔"

ترتیب

وصیت، جواہر لال نہرو

مضامین:

کمال احمد صدیقی

راجندر سنگھ بیدی

عبد القادر سروری

ڈاکٹر سید عابد حسین

نند لال واتل

ظ، انصاری

رام رتن پرہار

سید میر قاسم

ترلوچن دت

غلام محمد صادق

ڈاکٹر کرن سنگھ

جواہر پارے

جواہرات

تاریخی تاریخیں

۲۷ مئی کو پہلگام میں نیشنل کیڈٹ کور کا ایک کُل ہند تربیتی کیمپ تھا اور اس کے بارے میں ایک دستاویزی پروگرام بنانے کا کام میرے سپُرد کیا گیا۔ کئی روز سے سرینگر میں گرمی پڑ رہی تھی، اس لیئے دو روز پہلگام میں کام کرنے کا خیال بھی بڑا خوش کُن تھا۔ ۲۷ مئی کی سہ پہر کو جب پہلگام پہنچا تو راستے کی ہلکی سی بوندا باندی نے مینہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسی کی وجہ سے کچھ دیر بھی ہو گئی تھی۔ جیپ سے اُتر کر جیسے ہی کیمپ میں داخل ہوا تو کرنل بلیر سنگھ نے میجر جنرل دیریندر سنگھ سے تعارف کرایا اور انہوں نے جن الفاظ کے ساتھ خیر مقدم کیا وہ بڑے عجیب سے معلوم ہوئے۔ انہوں نے کہا ــــ

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، لیکن ہماری ملاقات ایک بڑے المیہ کے سلسلے میں ہو رہی ہے۔" ایک لمحہ کو خیال آیا کہ شاید جنرل کا اشارہ موسم کی طرف ہے۔ یعنی بارش کی وجہ سے ہم سب خیموں میں قید رہیں گے۔ لیکن پھر یہ خیال مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ ظاہر ہے یہ کوئی بڑا المیہ نہیں ہو سکتا۔ شاید جنرل نے بھی میرے چہرے سے بھانپ لیا۔ کہنے لگے ــــ "شاید آپ کو بھی پتہ نہیں۔ مجھے بھی ابھی ابھی یہیں پہنچ کر یہ منحوس خبر ملی ہے۔" میں نے پوچھا: "کون سی خبر ــــ؟"

"پنڈت نہرو گذر گئے۔"

پنڈت نہرو گذر گئے! میں نے سنا اور دماغ سُن ہو گیا ــــ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں پنڈت نہرو کی بہت سی تصویریں سینما کی ریل کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گذرنے لگیں۔ ان میں بہت سی تصویریں کشمیر کی تھیں۔ کیونکہ میں چودہ پندرہ سال سے یہاں ہوں، اور یہاں ان کو قریب اور دُور سے، ہر بار جب وہ یہاں آئے تو دیکھا۔ پنڈت نہرو کی ایک وہ تصویر بھی اس میں تھی، جب وہ وزیراعظم نہیں تھے۔ اس وقت میں لکھنؤ یونیورسٹی میں طالب علم تھا اور طلبا کی ایک کُل ہند تنظیم کے سرکردہ اراکین میں سے تھا۔ پنڈت جی نوجوانوں کے محبوب رہنما تھے۔ ہم لوگوں نے انہیں یونیورسٹی آنے کی دعوت دی، جو انہوں نے قبول کی۔ ان کی انقلابی

تقریر آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے
ملکی اور غیر ملکی مسائل کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ ہر بات "جگ سا
پزل" کے ٹکڑوں کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھتی گئی اور ایک مکمل تصویر
سامنے آگئی ـــــ ہندوستان کی، اور ساری دُنیا کی۔ جلد ہی پنڈت جی
انڈونیشیا جا رہے تھے۔ اس لئے قدرتی طور سے ان کے ذہن پر
وہاں کے بارے میں بہت سے خیالات تھے جو اُنہوں نے
کچھ اس طرح پیش کئے، جیسے وہ کوئی بیان نہیں دے رہے
ہیں بلکہ ساتھ ساتھ خُود بھی سوچ رہے ہیں۔

اس سانحہ کی اطلاع سے کچھ دیر کے لئے تو جیسے سکتہ سا ہو گیا
جب ذرا حواس دُرست ہوئے تو میں نے واپس سرینگر جانے
کے لئے اجازت چاہی۔ سب نے روکنا چاہا، لیکن میرے لئے رُکنا
ممکن نہیں تھا۔

ریڈیو اسٹیشن پہنچا تو ڈیوٹی روم میں صدر رادھا کرشنن کی
آواز گونج رہی تھی۔ وہ پنڈت جی کو شردھانجلی پیش کر رہے
تھے۔ معلوم ہوا کہ اسٹیشن ڈائریکٹر ابھی ابھی گئے ہیں اور میرے
لئے ہدایت چھوڑ گئے ہیں کہ آتے ہی اُن سے ملوں۔ اُن سے جا کے
ملا تو پروگراموں کے بارے میں انہوں نے کچھ ہدایتیں دیں۔ گھر پہنچا
تو رشتو (بیگم کمال) اور بچے منتظر تھے۔ سیما، آصف اور رانی

نے ایک ساتھ کہا۔ "چاچا نہرو امر ہو گئے۔ اب وہ یہاں
نہیں آئیں گے؟" میں نے کہا۔ نہیں، اب نہیں آئیں گے۔
سیما نے کہا۔ "اب چاچا نہرو کا اور آپ کا جلوس بھی نہیں نکلے گا"
میں نے کہا۔ نہیں! بچوں کے لئے پنڈت جی کا ہر جلوس، اُن کا اور
میرا مشترکہ جلوس ہوتا تھا۔ ریزیڈنسی روڈ کے ایک طرف پرتاپ پارک
ہے اور دوسری طرف میرا فلیٹ ہے جس کی چار کھڑکیاں سڑک کی
طرف کھلتی ہیں اور اسی سڑک پر سے پنڈت جی کا ہر جلوس گذرا
ہے۔ شاید یہ اتفاق ہو (یا محض اتفاق نہ ہو) کہ ۱۹۵۰ء سے جب
بھی پنڈت جی کشمیر آئے، ان کے استقبال اور ان کی مختلف مصروفیات
کو ریڈیو کے لئے ریکارڈ کرنے اور پروگرام تیار کرنے کی ذمہ داری
میرے سپرد کی جاتی تھی۔ چنانچہ جلوس میں پنڈت جی کی گاڑی سے
فوراً آگے کی گاڑی میں، یا جلوس کی پہلی گاڑی میں میں ہوتا تھا۔
محلّے بلکہ ہر محلّے کی خواتین پنڈت جی کی آمد کے روز میرے مکان پر
قبضہ کر لیتی تھیں۔ کسی نے بچوں سے کہدیا کہ وہ دیکھو تمہارے
ڈیڈی کا جلوس۔ جب میں گھر آیا تو بچے بہت خوش تھے کہ
انہوں نے میرا جلوس دیکھا۔ اور میرے ساتھ ساتھ انہوں نے
چاچا نہرو کو بھی دیکھا۔ اس کی بھی انہیں خوشی تھی، لیکن زیادہ
خوشی مجھے جلوس میں دیکھ کر ہوئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ چاچا نہرو

کون ہیں۔ میں نے اُنہیں بہت کچھ بتایا۔ وہ باتیں جو اُن کی سمجھ میں آئیں، ایسی باتیں بھی جو شاید ان کی سمجھ میں نہیں بھی آئیں۔ حکومت کیا ہوتی ہے، وزیرِاعظم کا کیا مقام ہوتا ہے، بچے ابھی ان اُلجھنوں کو نہیں سمجھتے۔ وہ سپاہی کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑا آدمی پائلٹ کو سمجھتے ہیں — اور پائلٹ سے بھی بڑا آدمی ڈرائیور کو سمجھتے ہیں۔ البتہ چاچا نہرو پر اس کلیے کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے پاس ہوائی جہاز بھی تھا اور وہ اس میں بیٹھ کر دِلّی سے آتے تھے۔ پھر وہ ریزیڈنسی روڈ سے ہو کر صرف اس لئے گذرتے تھے کہ بچّے اُن کا جلوس دیکھ سکیں۔

ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح ہوتے آنکھ لگی تو اس سے پہلے کچھ شعر موزوں ہو چکے تھے جو نو بجے دفتر جا کے براڈکاسٹ کے لئے دے دئیے۔ شہر میں ہر طرف سے ماتمی جلوس سینہ کوبی کرتے لال چوک کی طرف آنے لگے۔ میرے ذمّہ یہ کام ہوا کہ ان جلوسوں کی صوتی تصویریں ریکارڈ کروں اور پھر لال چوک میں ہونے والے ماتمی جلسے کی کارروائی ریکارڈ کر کے شام کے لئے ریڈیو رپورٹ مرتب کروں۔ اس جلسے میں جناب سید میر قاسم، جناب گردھاری لال ڈوگرہ، جناب محمد شفیع قریشی جناب ترلوچن دت اور بہت سے دوسرے معروف اور غیر معروف لوگوں نے پنڈت نہرو کو خراجِ عقیدت پیش کئے۔ شہر میں اور بھی کئی جلسے

ہوئے جن میں مختلف سیاسی نظریے رکھنے والے لوگوں نے پنڈت نہرو کی قومی اور بین الاقوامی خدمات کا ذکر کیا اور ان کو شردھانجلی پیش کی ان میں جناب محی الدین قرہ کی تقریر ایک یادگار تقریر تھی۔ اچھے مقرر اکثر ایسے موقعوں پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ "خطابت" ان کو لے ڈوبتی ہے۔ جناب محی الدین قرہ نے ایک ٹھیس لگے ہوئے دِل کی بات، ایک ٹھیس لگے ہوئے دِل کی زبان سے کہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریر نے دِلوں کو چھُوا۔ صدر ریاست ڈاکٹر کرن سنگھ اور وزیر اعظم جناب غلام محمد صادق مرحوم رہنما کے تئیں اپنی پُرخلوص عقیدتوں کا اظہار اپنے نشری پیغامات میں کر کے جہاز سے نئی دِلّی جا چکے تھے جہاں انہیں مرحوم رہنما کی آخری رسوم میں حاضری دینا تھی۔ پنڈت نہرو کے سب سے پرانے ساتھی اور سب سے بڑے عاشق جناب شیخ محمد عبداللہ اُس وقت پاکستان میں تھے۔ پنڈت جی کی اچانک وفات سے جو صدمہ ہوا، اس کا تصور کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ریڈیو نے خبروں کے لئے دُنیا کے دُور دراز علاقوں تک کو ایک دوسرے سے ملحق کر دیا ہے۔ پاکستان تو اسی برِصغیر کا ایک حصہ ہے۔ جناب شیخ محمد عبداللہ کو جو صدمہ پنڈت جی کی وفات سے پہنچا، اس کی خبریں ریڈیو سے یہاں پہنچیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اپنے تمام پروگرام منسوخ کر کے خاص جہاز سے پاکستان کے وزیر خارجہ کے ساتھ نئی دِلّی پہنچ رہے ہیں، جہاں وہ

پنڈت جی کی آخری رسوم میں شرکت کریں گے۔ ہر جگہ ریڈیو سے لوگ پنڈت جی کے آخری سفر پر تبصرہ سُن رہے تھے۔ شیخ صاحب کی حیثیت نہرو گھرانے کے افراد کی سی تھی اور جو صدمہ اُنہیں ہوا، اس کا ذکر بار بار ریڈیو کے مبصر کر رہے تھے۔

سہ پہر کو اسٹوڈیوز جا کے لال چوک کے جلسے کی ریکارڈنگ ایڈیٹ کر کے اور ریڈیو رپورٹ کے لئے مسوّدہ دینے کے بعد اپنے کمرے میں آیا اور رات کے لئے فیچر لکھنے بیٹھا۔ شام کو اسٹیشن ڈائریکٹر نے بُلا کر کہا کہ عزاداری کے دِنوں میں روز صبح پنڈت جی کے بارے میں ایک تقریر ہوگی اور یہ روز رات کو یا صبح مجھے لکھنا ہوگی۔ ظاہر ہے اس زمانے میں اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ پنڈت جی کی تصنیفات پر نظر ڈالی جا سکے۔ رات کو دیر سے گھر آنا ہوتا تھا اور پھر اتنا تھکا ہوتا تھا کہ کچھ لکھنا پڑھنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ صبح پانچ بجے "الارم" سے آنکھ کھلتی تھی اور لکھنے بیٹھ جاتا تھا۔ چھ بجے تک تقریر کا مسوّدہ تیار ہو جاتا تھا۔ رشو بڑی باقاعدگی سے، آدھ گھنٹے میں چپراسی کے آنے سے پہلے اس کی نقل تیار کر کے ایک فائل میں رکھ لیتی تھیں۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کی بُنیاد یہی فائل ہے۔ کیونکہ انہوں نے ضد شروع کی کہ ان تقریروں کو پنڈت جی کے تئیں خراجِ عقیدت کے طور پر کتاب کے رُوپ میں

شائع کر دیا جائے۔

پنڈت جی کی استھیاں سرینگر آئیں تو ہوائی اڈہ اور ہوائی اڈے سے راج گڈھ تک کا راستہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن گیا تھا۔ کشمیر میں پنڈت نہرو کا یہ آخری جلوس تھا۔ اور یقیناً کشمیر میں یہ اُن کا سب سے بڑا جلوس تھا۔ اس جلوس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کو اس طرح سرکاری طور پر منظم نہیں کیا گیا تھا جس طرح پچھلے جلوس منظم کیے جاتے تھے۔ اسٹیشن ڈائریکٹر نے فیصلہ کیا کہ استھیوں کے ہوائی اڈے پر پہنچنے اور ہوائی اڈے سے راج گڈھ تک ان کے لے جائے جانے کا آنکھوں دیکھا حال رواں تبصرے کی صورت میں نشر ہو۔ ہوائی اڈے، لال چوک اور راج گڈھ میں براڈ کاسٹ کے لئے مرکز مقرر ہوئے۔ طے یہ ہوا کہ رواں تبصرہ ریڈیو کے اہل کار ہی کریں گے۔ اگرچہ کچھ لوگ ایک آدھ بار پہلے بھی جلوسوں پر کمنٹری کر چکے تھے، لیکن جسے پیشہ ور کمنٹیٹر کہا جا سکے، ایسا ہم میں سے کوئی نہیں تھا۔ چاولہ صاحب (اسٹیشن ڈائریکٹر) پروگرام کے آدمی ہیں، براڈ کاسٹ کی نزاکتوں کو نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ پروگراموں کی ترتیب اور پیش کش میں تخلیقی حصہ لیتے ہیں، اس لئے اکثر ان کا منصب بھی پروگراموں کے سلسلے میں ان کی جراتِ رندانہ کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔ اپنے ماتحتوں کے بارے میں اُنہیں خاصی خوش فہمیاں ہیں

اور اُنہیں خوش فہمیوں کی بنا پر وہ ایسا بارِ گراں سونپ دیتے ہیں جو
بظاہر صلاحیت سے کچھ زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے، لیکن شرم یہ آ پڑتی
ہے کہ انکار کیا کریں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو اندازے وہ خوش فہمی کی
بنا پر لگاتے ہیں وہ کبھی غلط نہیں ثابت ہوتے۔ کمنٹری میرے لئے
پہلا تجربہ تھا اور اس بات کا بھی احساس تھا کہ سب سے مشکل جگہ
ہوائی اڈہ ہے، لیکن میں نے اپنے لئے ہوائی اڈہ مانگا۔ خود چاولہ صاحب
او، بی (باہر کے براڈ کاسٹ) کے انچارج تھے۔ قیصر قلندر کو اور مجھے
اُردو میں حال بیان کرنا تھا اور سوم ناتھ سادھو کو آخر میں خلاصہ
کشمیری میں دینا تھا۔ جہاز کے آنے سے کچھ دیر پہلے تک کوئی ۳۰ منٹ
تک قیصر نے بڑی سلاست روی کے ساتھ آنکھوں دیکھا حال بتایا۔
مائیکروفون میرے حوالے کیا گیا تو ایسا معلوم ہوا کہ پاؤں تلے سے زمین
کھسک رہی ہے۔ لیکن یہ کیفیت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں رہی۔ جو
دیکھ رہا تھا، بتانا شروع کیا۔ پھر پنڈت جی کے پچھلے دَوروں کے منظر
نظر کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ آج کی خاموشی اور پچھلے منظروں کی گونج،
دونوں میں بڑا تضاد تھا۔ لیکن کوئی ایسا تضاد بھی نہیں تھا۔ وہ پنڈت
نہرو کا استقبال تھا اور یہ اُن کی استھیوں کو تعظیم۔ مجھے رونا ذرا
مشکل ہی سے آتا ہے، لیکن ایک جگہ گلا رُندھ گیا اور رو پڑا۔ جلدی
ہی دوسری جگہ سے مائیکروفون قیصر نے سنبھال لیا۔

استھیول کا کلش لے کر دِلّی سے صادق صاحب آئے تھے۔ جناب مرزا محمد افضل بیگ کو شیخ محمد عبداللہ صاحب نے خاص طور سے اسی جہاز سے سرینگر بھیجا تھا کہ وہ استھیول کو یہاں تعظیم پیش کریں۔ جناب محی الدین قرہ اور ان کی طرح مختلف سیاسی عقیدوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ پنڈت جی کے "پھولوں" کے کلش پر پھول چڑھائے۔ یہ بڑا دل خراش منظر تھا اور اس کو دوبارہ بیان کرنا بڑا مشکل ہے۔ رواں تبصرہ نشر ہونے کے ساتھ ساتھ ریکارڈ بھی کر لیا گیا تھا۔ اس ریکارڈ کو سن کر ایک رپورٹ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ تفصیلی رپورٹ بھی تشنہ معلوم ہوئی۔ ریکارڈ سُنا تو معلوم ہوا کہ دوسرے ساتھیوں بشیر بٹ، میر غلام رسول نازکی، پران کشور اور علی محمد لون نے شہر کے مرکزوں سے بہت صاف ستھرا تبصرہ نشر کیا۔ یہ استھیول کا جلوس تھا، رنگا رنگ پروگرام نہیں تھا۔ لیکن کسی رنگا رنگ پروگرام پر بھی ایسا تبصرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ پنڈت نہرو کی ہمہ گیر شخصیت ہر ایک کے لئے پُر کشش تھی اور ہر ایک کے پاس اُن کے بارے میں کہنے کے لئے کوئی نئی بات تھی۔ اس لئے جملوں تک کی تکرار یہاں نہیں تھی۔

پنڈت نہرو کو یُوں تو ساری دُنیا نے خراجِ عقیدت پیش کیا لیکن اس سلسلے میں ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن اور ڈاکٹر ذاکر حسین

کی تقریریں یادگار ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی وہ تقریر جو پنڈت نہرو کے انتقال کے روز نشر ہوئی۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی وہ دونوں تقریریں، جو اُنھوں نے رام لیلا میدان دلی اور الٰہ آباد میں استھیوں کے سنگم کُپسپردِ آب کرنے کے بعد کیں

جناب نند لال چاؤلہ نے اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں ذاتی دلچسپی لی اور نہ صرف مفید مشورے دئیے بلکہ سہولتیں بھی فراہم کیں جس کا اعتراف شکریہ کے ساتھ کرتا ہوں۔ میں اُن سب بزرگوں اور احباب کا بھی شکر گذار ہوں جن کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔

جواہر لال نہرو کو یہ کشمیر کا خراج عقیدت ہے۔ اگرچہ نامکمل ہے اس کتاب کو اسی نظر سے دیکھنا مناسب ہوگا۔

ریزیڈنسی روڈ سرینگر (کشمیر)

کمال

۱۲ جون ~~۱۹۶۶ء~~ ۱۹۶۷ء

وصیّت

جواہر لال نہرو

"مجھے بھارت کے لوگوں کا اتنا پیار حاصل ہوا ہے کہ میرے لئے اس کے ایک قلیل حصّے کی ادائیگی بھی ممکن نہیں اور درحقیقت محبت جیسی قیمتی چیز کی قیمت ادا کی بھی نہیں جا سکتی۔ میں اپنے آپ کو اس محبت کے بوجھ تلے دبا ہوا پاتا ہوں اور محض یہ توقع کر سکتا ہوں کہ اپنی زندگی کے باقی دنوں میں اپنے ملک کے لوگوں کی محبت کے نااہل ثابت نہیں ہوں گا۔ میں اپنے بے شمار ساتھیوں کا اس سے بھی زیادہ ممنون ہوں جن کے ساتھ میں بڑی بڑی ذمہ داریوں میں شریک کار رہا ہوں اور ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے دوران میں کامیابیوں اور ناکامیوں کے احساس میں بھی ان کا حصہ دار رہا ہوں۔

میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنی اس خواہش کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میری موت کے بعد کسی قسم کی مذہبی رسوم نہ ادا کی جائیں۔ میرا اس قسم کی رسوم میں اعتقاد نہیں اور رسوم کے طور پر بھی انہیں تسلیم کرنا ریاکاری اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کی کوشش کے برابر ہوگا۔

میں چاہتا ہوں کہ موت کے بعد میرے جسم کو جلایا جائے اگر میں کسی غیر ملک میں مرجاؤں تو میرے جسم کو وہیں جلایا جائے اور میری استھیاں الہ آباد بھیجدی جائیں۔ اور ان کا مٹھی بھر حصہ گنگا ندی میں بہا دیا جائے۔ میری استھیوں کا کوئی حصہ باقی یا محفوظ نہیں رکھا جائے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے الہ آباد میں گنگا میں پھول پرواہ کرنے کی میری خواہش کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں الہ آباد میں بچپن سے ہی مجھے گنگا اور جمنا سے لگاؤ رہا ہے۔ اور میری عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ لگاؤ اور بھی پختہ ہوتا رہا ہے۔ میں نے مختلف موسموں میں ان ندیوں کی ترنگوں کو دیکھا ہے اور صدیوں سے ان سے جو تاریخ قصے کہانیاں اور گیت اور سنگیت وابستہ ہوگئے ہیں اُن پر غور و فکر کیا ہے۔ گنگا ندی بھارت کے لوگوں کو خاص طور پر پیاری ہے۔ بھارت میں مختلف نسلوں کے لوگوں کی آبادکاری، بھارت کی اُمیدوں اور اس کے اندیشوں اور اس

کی فتوحات اور شکستوں کی کہانی گنگا کے سینے میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ ندی بھارت کی قدیم تہذیب و ثقافت کی علامت ہے یہ مجھے ہمالیہ کی وادیوں اور برف سے ڈھکی چوٹیوں کی جن سے مجھے بے پناہ پیار ہے اور ان وسیع اور زرخیز میدانوں کی جہاں میں نے زندگی کے کام کا آغاز کیا، یاد دلاتی ہے۔ گنگا ندی کا تصور میرے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ بھارت کے ماضی کی علامت ہے جو زمانہ حال میں سے گذرتی ہوئی مستقبل کے مہان ساگر کی طرف بہہ رہی ہے۔ اگرچہ میں نے ماضی کی بہت سی روایات و رسوم کو ترک کر دیا ہے۔ اور میری زبردست خواہش ہے کہ بھارت کو ان تمام بندھنوں سے نجات حاصل ہو جو اس کے بہت سے لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، ان کے پھولنے پھلنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور ان میں نفاق پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ تاہم میں ماضی سے اپنا رشتہ بالکل ہی نہیں توڑ لینا چاہتا۔ مجھے اپنے عظیم ورثے پر فخر ہے اور مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میں بھی بھارت کے دوسرے لوگوں کی طرح اس زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس کا ایک سرا بھارت کی قدیم ترین تاریخ تک پہنچتا ہے۔ اس بندھن کو میں توڑنا نہیں چاہتا کیونکہ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور یہ میرے اندر اُمنگیں اور ولولے پیدا کرتا ہے۔ بھارت کے ثقافتی ورثے کے تئیں آخری عقیدت کے

طور پر میں یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میری مُٹھی بھر استھیاں الہ آباد کے مقام پر گنگا میں بہا دی جائیں تاکہ وہ اس مہان ساگر میں مل جائیں جو بھارت کے ساحل کو چھو رہا ہے۔ میری استھیوں کا بیشتر حصہ ہوائی جہاز کے ذریعے ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں بھارت کے کسان محنت و مشقت کرتے ہیں تاکہ وہ بھارت کی مٹی میں مل کر بھارت ہی کا ناقابل تمیز جزو بن جائیں۔"

جواہرلال نہرو
کی
یاد میں

کمال احمد صدیقی

(۱)

جواہر لال نہرو اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ جواہر لال نہرو ایک فرد واحد کا نہیں۔ ایک قوم کے ۴۵ کروڑ دِلوں کی دھڑکن کا نام تھا۔ یہ انجمن اور ۴۵ کروڑ دلوں کی یہ دھڑکن مضمحل ہوگئی ہے۔ ہر آنکھ نم ہے۔ ہر دل بجھا ہوا ہے۔ ہر گلا رندھا ہوا ہے۔ ہم جواہر لال کا ماتم نہیں کر رہے ہیں۔ ہم اپنی ان تمنّاؤں کا ماتم کر رہے ہیں۔ جن کی تکمیل اُن کے ہاتھوں سے ہوئی اور ہم اپنی اُن تمنّاؤں کا ماتم کر رہے ہیں جو ابھی پوری نہیں ہوئی ہیں اور جن کی تکمیل ایسا معلوم ہوتا ہے۔ صرف جواہر لال کے ہاتھوں ممکن تھی۔ جواہر لال نہرو کا ہم سے بچھڑ جانا ہماری ہی زندگی کا نہیں تاریخ کا ایک سانحہ ہے باہر والوں ہی کے لئے نہیں خود ہمارے لئے بھی جواہر لال نہرو ہندوستان

تھے۔ آپ کی زندگی نئے ہندوستان کی تاریخ ہے۔ تاریخ کا ایک باب۔ ایک سنہری باب۔ کیسے کہیں۔ کس زبان سے کہیں۔ کس دل سے کہیں کہ یہ باب ختم ہوا۔ دُنیا کو جواہر لال نہرو اس لئے عزیز تھے کہ انہوں نے سرد اور گرم جنگ سے گھبرائی ہوئی دنیا کو اٹیمی جنگ کی تباہی سے محفوظ رکھا۔ محکوم ملکوں کو جواہر لال نہرو اسلئے عزیز تھے کہ وہ نوآبادیاتی راج کی مخالفت اور محکوم ملکوں کی آزادی کی حمایت میں بے باک تھے۔ ہم کو جواہر لال نہرو اس لئے عزیز تھے کہ وہ ہماری زندگی تھے۔ ہماری زندگی کا وہ حصّہ جو بہترین ہے ماضی اور حال کے ہندوستان کی بہترین روایات اور اہل ہند کی تمنّاؤں اور خوابوں کا ایک پیکر بنایا جائے۔ تو وہ جواہر لال نہرو کی شخصیت ہے۔ جواہر لال نہرو جمہوریت کے جنم داتا ہی نہیں اُس کے پالن ہار بھی تھے۔ آج ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ہے تو اس وجہ سے کہ جواہر لال نہرو جمہوریت پرستوں میں سب سے بڑے جمہوریت پرست تھے۔ جس لگن اور سرگرمی سے آپ نے تحریک آزادی میں کام کیا اُسی لگن اور سرگرمی سے آپ نے آزادی کے فائدے ایک ایک ہندوستانی تک پہنچانے کے لئے اور مساوی حصہ پہنچانے کے لئے کام کیا۔ یہ بہت بڑا کام تھا اور یہ صرف جمہوری نظام میں ہی ممکن ہے اس لئے جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ بنانے کے لئے جدو جہد شروع کی۔ یہ

ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان میں جمہوری اداروں کا قیام جواہر لال نہرو کا مرہون منت ہے۔ کیونکہ آزادی کے بعد عوام نے اپنی مرضی سے اپنے انتخاب سے حکومت کی باگ ڈور ان کے حوالے کر دی۔ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی جواہر لال نہرو نے خود کو عوام کی مرضی کا پابند کر دیا۔ کیونکہ ان کی نظر تاریخ پر تھی۔ جس کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اقتدار بدعنوانی کی ترغیب دیتا ہے اور مکمل اقتدار مکمل بدعنوانی کی طرف لے جاتا ہے۔ جواہر لال نے اپنی ساری قوت بدعنوانی اور بدعنوانی کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے استعمال کی اور پارلیمنٹ کو ایک مؤثر ادارہ بنایا۔ اگر ایسا ہوا کہ کوئی اطلاع انہوں نے پارلیمنٹ سے پیش کرنے سے پہلے کسی سوال کے جواب میں اخبار نویسوں کو دیدی اور اس پر ایوان کے کسی ممبر نے اعتراض کیا تو جواز اور تاویل پیش کرنے کے بجائے آپ نے ہمیشہ معذرت کی ہے۔ ایسے سبھی موقعوں پر ہمیشہ جواہر لال نہرو نے معذرت کی ہے۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے آپ کے کئی نائب اور پارلیمانی سیکرٹری تھے۔ لیکن آپ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شریک ہوں اور ایوان کی کاروائی میں حصہ لیں۔ آپ اس بات پر بھی نظر رکھتے تھے کہ دوسرے وزیر بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے کیونکہ اس نے پارلیمنٹ کو مؤثر جمہوری ادارہ بنایا ہے۔ ورنہ یہ بہت

آسان بات تھی کہ پارلیمنٹ میں اُن کی پارٹی کی اکثریت تھی۔ اور
اس اکثریت کی بناء پر حکومت کی بات منوائی جا سکتی تھی۔ لیکن
آپ نے پارلیمنٹ کو محض ضابطے کی کارروائی کا ادارہ نہیں بننے دیا۔
پارلیمنٹ کا قیام، ایک جمہوری ادارے، ایک باوقار جمہوری ادارے اور
ایک موثر جمہوری ادارے کی حیثیت سے جواہر لال نہرو کے عظیم
کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ محض ایک اتفاق نہیں
کہ ۲۷ مئی کو جب جواہر لال نہرو نے ابدی نیند کے لئے آنکھیں بند کیں
تو پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا اور یہ اجلاس اسی روز شروع ہوا
تھا۔ یہ اجلاس اُنہیں کی خواہش پر طلب کیا گیا تھا۔ کل دن میں
گیارہ بجے جب پارلیمنٹ کے دونوں ایوان الگ الگ ملے۔ تو یہ
بڑا دردناک منظر تھا۔ اتنی بڑی پارلیمنٹ پر ایک جواہر لال نہرو
کی غیر موجودگی چھائی ہوئی تھی۔ یہ ایک شخص کی کمی نہیں تھی۔ یہ ایک
خلا تھا جو اس لئے اور بھی بڑا تھا کہ ایک جواہر لال نہرو نہیں تھے۔
باقی سب ممبر موجود تھے۔ حکمران پارٹی اور حزب اختلاف کا فرق
مٹ چکا تھا۔ سب اُداس تھے۔ سب کی آواز غم سے بھرائی
ہوئی تھی۔ آنکھیں روئی روئی سی تھیں۔ آنسو پلکوں تک آتے
تھے۔ کبھی ٹپک پڑتے تھے کبھی رومال میں جذب ہو جاتے تھے۔ جہاں
آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہاں بھی طغیانی تھی۔

چار روز سے دُنیا کے بڑے بڑے مفکر، عالم، دانش ور

سیاست دان، اور عام آدمی۔ سبھی جواہر لال نہرو کا ماتم کر رہے ہیں اور ان کے اوصاف کا ذکر کر رہے ہیں۔ بہت سے تاثرات ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ہیں۔ بہت سے پہلو نئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن سب محسوس کرتے ہیں کہ ابھی اس عظیم شخصیت کے کسی بھی پہلو پر پوری طرح روشنی نہیں پڑی۔ غم اتنا تازہ ہے اور صدمہ اتنا شدید کہ جواہر لال کو عقیدت اور شردھانجلی پیش کرتے ہوئے آپ کی خوبیوں کو اس طرح بیان کرنا کہ آپ کی شخصیت سے کسی حد تک انصاف ہو سکے۔ ممکن نہیں۔ یہ کام ان کے لئے تو اور بھی مشکل ہے جو آپ کے نزدیک تھے۔ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے ذہن آنسوؤں سے تر آنکھیں اور رندھے ہوئے گلے جو شردھانجلی پیش کر سکتے تھے وہ انہوں نے پیش کی۔

ہندوستان میں مختلف خیال، مختلف سیاسی نظریے رکھنے والے لوگ ہیں۔ پارلیمنٹ انہیں کا آئینہ ہے۔ اپنے سیاسی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود سب اس بات پر متفق تھے۔ کہ جواہر لال نہرو کا بچھڑ جانا ملک اور قوم کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ مخالف بینچوں پر بیٹھنے والے ممبروں کے تاثرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے ہیرن مکرجی نے کہا دنیا بھر میں سیاست میں کسی لیڈر کو عوام کا اتنا پیار نہیں ملا ہوگا۔ جتنا جواہر لال نہرو کو ان کے ہم وطنوں سے ملا۔

سوتنتر پارٹی کے پروفیسر رنگا نے کہا۔ جواہر لال نہرو کی وجہ سے ہی آج ہمارے ملک میں پارلیمانی جمہوریت کی بنیادیں اتنی مضبوط ہوئی ہیں۔

جن سنگھ کے برج راج سنگھ نے کہا۔ جواہر لال نہرو کی وفات سے اس عظیم ملک نے ایک عظیم فرزند کو کھویا ہے۔ آپ دنیا کے لئے امن کے پیغامبر تھے۔

نئے ہندوستان کا معمار۔ محکوم قوموں کا غم خوار اور عالمی امن کا علمبردار۔ ہمارا یہ میر کارواں، مرد راہ داں۔ ہم سے بچھڑ گیا۔ اس کے آدرش اُس کے اصول ہمارے سامنے ہیں۔ ہم اس کے آدرشوں کو زندہ رکھیں گے۔ تاکہ وہ ہمارے دلوں میں زندہ رہے۔ ہم اُس کے اصولوں کو زندہ رکھیں گے۔ تاکہ نیا ہندوستان زندہ رہے۔ کیونکہ نیا ہندوستان اس کی سب سے بڑی یادگار ہے جو اُس نے اپنے لئے نہیں۔ ہمارے لئے بنائی۔ آنے والی نسلوں کے لئے بنائی۔ اور ہم اس یادگار کو اس کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

۳۰ر جون ۱۹۶۴ء

---

(۲)

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کشمیر، جو اپنی شادابی اور اپنے رنگا رنگ نظاروں کے لئے مشہور ہے۔ آج اپنے محبوب راہنما جواہر لال نہرو کی جدائی کے غم میں سیاہ پوش ہے، ہر دل میں ٹیس ہے۔ ہر آنکھ میں آنسو ہیں۔ یوں تو جواہر لال نہرو کی وفات کا صدمہ سارے ملک بلکہ ساری دنیا کو ہوا ہے۔ لیکن کشمیر کو نہرو سے اور نہرو کو کشمیر اور اہلِ کشمیر سے ایک قریبی تعلق تھا۔ ایک خاص تعلق تھا ایک والہانہ تعلق تھا۔ وہ تعلق تھا جو الفاظ بیان نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات سے جو صدمہ اہلِ کشمیر کو ہوا ہے

وہ بھی الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ کل سے کشمیر میں سارے دفتر اور سرکاری اور کاروباری ادارے بند ہیں۔ عمارتوں پر سیاہ ماتمی جھنڈے ہیں۔ قومی پرچم سرنگوں ہے۔ لوگوں کے بازوؤں پر سیاہ پٹیاں ہیں ابھی پچھلے سال جب پنڈت جی کشمیر تشریف لائے تھے تو ہمیشہ کی طرح سارا شہر ان کے استقبال کے لئے امنڈ پڑا تھا۔ آج بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر نالہ و شیون کرتا سڑکوں پر آگیا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشان ہونا

عناصر میں یہ ترتیب مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور پریشان تو یہ دیکھتے دیکھتے ہو جاتے ہیں جیسے آج وہ اجزا پریشان ہو گئے جن کا مجموعہ جواہر لال نہرو کی جسد خاکی تھی۔ جس کو آج راج گھاٹ میں سپرد آتش کر دیا گیا اور جس کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے دنیا کی بڑی بڑی حکومتوں کے سربراہ یا ان کے نمائندے نئی دہلی آئے۔ جواہر لال نہرو کی شخصیت اس ملک پر ہی نہیں۔ اس صدی کی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ آج سارا ملک ان کی وفات کا سوگ منا رہا ہے۔ صرف ہندوستان نہیں بلکہ ساری دنیا کی حکومتوں کے پرچم سرنگوں ہیں۔

آج جواہر لال نہرو اپنے جسمِ خاکی کے ساتھ دنیا میں

موجود نہیں ہیں تو دنیا کسی چیز کی کمی محسوس کر رہی ہے، وہ امریکی صدر ہوں۔ سوویت وزیراعظم ہوں۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر ہوں یا کشمیر کا ایک عام کسان۔ سب محسوس کرتے ہیں جیسے ان کی کوئی عزیز چیز کھو گئی ہے۔ اور اس عزیز چیز کے کھونے سے جیسے دنیا وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔

اُس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی
گویا وہ آسمان نہیں — وہ زمیں نہیں

جواہر لال نہرو اور ہندوستان۔ یہ دونوں نہ صرف ہمارے لئے، بلکہ ساری دُنیا کے لئے ہم معنی تھے۔ جواہر لال نہرو کے بغیر ہندوستان کا تصوّر کرنا بھی ایک ناممکن سی بات ہے۔ ان کی شخصیت، جمہوریت، قومی یکجہتی، وطن اور اہلِ وطن کے وقار میں جاری و ساری ہے۔ یہ تصوّر انہیں کی دین ہے، کہ وطن زندہ ہے، تو قوم زندہ ہے اور قوم زندہ ہے تو ہم زندہ ہیں۔ جب تک جواہر لال نہرو موجود تھے۔ ہمیں یہ خیال نہیں آیا۔ آج ان کے جُدا ہوتے ہی احساس ہوا کہ جواہر لال نہرو کے آدرش زندہ ہیں، تو وطن زندہ ہے، وطن زندہ ہے تو قوم زندہ ہے اور قوم زندہ ہے تو ہم زندہ ہیں۔ جواہر لال نہرو کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کشمیر سے کنیا کماری تک آج لوگوں نے عہد کیا

ہے کہ وطن کو زندہ رکھنے کے لئے اور قوم کو زندہ رکھنے کے لئے ہم اُن آدرشوں کو زندہ رکھیں گے جو جواہر لال نہرو کو عزیز تھے - اس راستے پر چلیں گے جو نہرو کا راستہ ہے - یہ راستہ ہے امن کا، جمہوریت کا، صلح اور آشتی کا -

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانہ پہ کیا گذری

آج ہندوستان اس جواہر لال نہرو سے محروم ہو گیا ہے جس نے اپنی جوانی ملک کی جنگ آزادی کے لئے نذر کی اور آزادی کے حصول کے بعد اپنی باقی عمر اس ملک کی زندگی کو ایک نئی ترتیب دینے کے لئے وقف کی - آج دنیا اس جواہر لال سے محروم ہو چکی ہے جس کو عرب ملکوں میں رسوالسلام یعنی امن کے قاصد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے جواہر لال نہرو کی جُدائی کس کی محرومی زیادہ ہے - ہم اہلِ ہند کی یا دنیا کی - عظیم شخصیتیں عالمی شخصیتیں ہوتی ہیں - وہ ملک کی چار دیواری میں قید نہیں رہ سکتیں - وہ اپنے ملک کے لئے بھی ہوتی ہیں اور ساری دُنیا کے لئے بھی - یہ معیار اگر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو ہمارے محبوب رہنما جواہر لال نہرو اُن چند شخصیتوں میں سے تھے جو صدیوں کے انتظار کے بعد دُنیا کو نصیب ہوتی ہیں - یہ ہماری خوش قسمتی تھی

کہ جواہر لال نہرو ہم میں پیدا ہوئے اور آج یہ دنیا کے مقابلے میں ہماری ہی زیادہ بدنصیبی ہے کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

جواہر لال نہرو کی زندگی ایک اَن تھک کوشش تھی۔ ہندوستان کو اُوپر اُٹھانے کی۔ موت نے یہ زندگی۔ اور یہ روشنی ہم سے چھین لی ہے۔ لیکن ان کے آدرشوں اور اُن کے اصولوں کے چراغ محفوظ ہیں۔ ان کی زندگی کی روشنی ہم سے چھن گئی ہے لیکن ان کے آدرشوں کی روشنی کوئی ہم سے نہیں چھین سکتا۔ یہ وہ چراغ ہیں جنہیں کوئی آندھی گل نہیں کر سکتی۔ یہ وہ روشنی ہے جس پر کوئی تیرگی غالب نہیں آسکتی۔ باوجود اس کے جواہر لال نہرو کا بتایا ہوا راستہ ہمارے سامنے ہے۔ باوجود اس کے جواہر لال نہرو کے اصول ہماری رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔ یہ سانحہ قیامت سے کم نہیں ہے کہ موت کے بے درد ہاتھوں نے جواہر لال کو ہم سے چھین لیا ہے ؎

(۲۸ر جون ۱۹۶۴ء)

(۳)

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یہ دُنیا، یہ کائنات، ہمیشہ سنورتی رہتی ہے۔ صرف تبدیلی کافی نہیں ہے۔ تبدیلی وُہ ہونا چاہیئے جو آگے لے جائے، بہتر کی طرف لے جائے۔ یہ بصیرت تو بہتوں میں ہوگی لیکن اس بصیرت کو ملک و قوم کی ترقی کے لئے جواہر لال نہرو نے ہی استعمال کیا۔ قدیم ہندوستان میں جو کچھ بہترین تھا۔ اس کو انہوں نے نئے ہندوستان کی بنیاد بنایا۔ لیکن نئے ہندوستان کے لئے انہوں نے جو خاکے بنائے، جو نقشے بنائے وہ نئے تھے۔ ان معنوں میں کہ وہ سائنسی عہد کے تقاضوں کے مطابق تھے جواہر لال نہرو کے خوابوں کا ہندوستان۔ جس کی بہت مستحکم بنیاد اُنہوں

نے ڈالی اور جس کو بنانے کی سعادت اس نسل کو حاصل ہوئی وہ ہر معیار سے جدید ہے اور ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی میراث کا نمونہ بھی ہے۔ جواہر لال نہرو کا دل وسیع تھا۔ ان کا دماغ وسیع تھا۔ ان کی نظر وسیع تھی۔ ان کے خیالات وسیع تھے۔ اور ان سب کی وسعت ہمیں نئے ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت قدیم اور جدید کا سنگم تھی۔ ان کے یہاں قدیم اور جدید کی کشمکش نہیں تھی۔ قدیم اور جدید کا توازن تھا۔ سائنسی معاملات میں ان کی رہنمائی بہت واضح تھی۔ سائنسی کھوج سائنسی ترقی اور ٹکنالوجی کو بڑھاوا دینے اور ان سے جدید ہندوستان کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کو اُنھوں نے سب سے زیادہ اہمیت دی اور ان کاموں کے لئے بڑی حوصلہ افزائی کی۔ آج سارے ملک میں سائنسی کھوج کے اداروں اور لیبارٹریوں کا جو جال بچھا ہوا ہے۔ وہ جواہر لال نہرو کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

جواہر لال نہرو کٹر خیالات کے نہیں تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں، اسی میں ملک اور قوم کی بھلائی ہے اُنھوں نے کبھی اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ لوگوں کو آمادہ کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ پنچایتی راج اور دیہی کوآپریٹو کی بنیاد پر وہ ہندوستان میں ایک خاموش انقلاب لانے

کو بھاری صنعتوں کے قیام کے برابر بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یہ اس لئے کہ وہ اول و آخر جمہوریت پرست اور جمہوریت نواز تھے۔ عوام کو جو بے پناہ اعتماد اُن پر تھا۔ اُس سے بھی زیادہ اعتماد ان کو عوام پر تھا۔ اس لئے انہوں نے سیاسی اقتدار کی مرکزیت کو ختم کیا۔ اور جمہوریت اور اس کی برکتوں کو گاؤں کی سطح تک پہنچایا۔ ان کو اپنے اس منصب کا احساس تھا کہ ملک اور قوم کی رہنمائی کرنے کا کام انہیں کرنا ہے۔ یہ بہت مشکل کام تھا کیونکہ ملک میں جہالت کا دَور دَورہ تھا۔ جہاں جہالت ہو وہاں توہمات اور تعصبات کی گرفت ذہنوں پر بہت مضبوط ہوتی ہے اور جہاں یہ دو باتیں ہوں، وہاں نئے خیالات کے لئے اور نئے طریقوں کے لئے جگہ بنانا اور اُنہیں رائج کرنا بہت کٹھن کام ہوتا ہے۔ ایک ڈکٹیٹر کے لئے بہت آسان ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی ملک پر مسلط کر دے۔ لوگ بادلِ ناخواستہ حکومت کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ بے دلی سے عوام کی اس تعمیل کے کچھ بہت اچھے نتائج نہیں نکلتے۔ جو کام ایک ڈکٹیٹر نہیں کر سکتا وہ جواہر لال نہرو نے اپنی مقناطیسی شخصیت سے جمہوریت کے راستے سے کیا۔ انہوں نے عوام پر اعتماد کیا تو عوام میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور انہوں نے اپنے محبوب رہنما کا ہر مشورہ قبول کیا۔ یہ اس عہد کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

(۴)

ہندوستان صدیوں سے تہذیب و تمدّن کا گہوارہ رہا ہے لیکن تین چوتھائی صدی قبل جواہر لال نہرو جس ہندوستان میں پیدا ہوئے وہ غلامی، مُفلسی اور جہالت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ کم لوگوں کو اپنے عظیم تہذیبی ورثے کا علم تھا۔ احساس تو دُور کی بات ہے، علاقائی اور صوبائی وفاداریاں، وطن پرستی سمجھی جاتی تھیں جواہر لال نہرو نے جس ہندوستان میں جنم لیا اور جو ہندوستان موجودہ نسل کے سُپرد کیا، ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج بھی ہندوستان میں مختلف علاقوں سے نسبت رکھنے والے لوگ ہیں، لیکن آج جس بات پر وُہ فخر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ نئی نسل کو یہ دَین نہرو کی ہے۔ نہرو نے اپنے لئے، ہمارے لئے اور دُنیا کے لئے ہندوستان کو ازسرِ نو

دریافت کیا۔ اس کی عظمتوں اور اس کے دُکھوں کے اسباب کو دریافت
کیا۔ ہندوستان سے آپ کی یہ دلچسپی والہانہ تھی۔ آپ نے محسوس
کیا کہ ہندوستان کی پستی کی بُنیادی وجہ تنگ دستی اور تنگ
نظری ہے۔ آپ نے محسوس کیا کہ غلامی کے اندھیرے کو دُور
کیئے بغیر ہندوستان کی پستی کے اسباب کو مِٹانا ممکن نہیں۔ چنانچہ
آپ نے خُود کو آزادی کی جدوجہد کے لئے وقف کر دیا۔ ہندوستان
آزاد ہوا تو قوم نے آپ کی قومی خدمات کے اعتراف میں آپ ہی کو
وزیراعظم چُنا۔ جواہر لال نہرو کو وزیراعظم چُن کر اور آخر دَم تک
آپ کو اس عہدے پر فائز رکھ کے قوم نے آپ کی نہیں بلکہ خُود
اپنی عزت افزائی کی۔ قوم کو جو اعتماد آپ پر تھا وہ کوئی یک طرفہ
بات نہیں تھی۔ آپ کو بھی قوم پر مکمل اعتماد تھا اور آپ تمام
ہندوستانیوں میں خُود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ خود اعتمادی
کے بغیر انفرادی صلاحیتیں اُبھر ہی نہیں سکتیں۔ جس سرگرمی سے آپ
آزادی سے قبل آزادی کے حصول کے لئے لڑے، اُسی سرگرمی
سے آپ نے ہندوستان کو جمہوریہ بنانے کے لئے کام کیا۔ اور آئین کی
منظوری کے بعد عوام کے جمہوری حقوق کے تحفّظ کو آپ نے ایک
مُقدّس فرض سمجھا۔ جو ہندوستان انہوں نے نئی نسلوں کے لئے میراث
کے طور پر چھوڑا ہے وہ دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ہے۔ جمہوریت

کا اتنا بڑا اور اتنا کامیاب تجربہ تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔
جواہر لال نہرو کی وفات ہمارے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔
بقول صدر رادھا کرشنن، اپنے محبوب رہنما سے عقیدت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو آدرش جواہر لال نہرو کو عزیز تھے، ہم اُن کے حصول کے لئے دِل و جان سے کام کریں۔

آئیے عہد کریں کہ ہم اپنی جمہوریت اور اپنی آزادی کی حفاظت کریں گے اور علاقے، مذہب اور ملّت کے لحاظ کے بغیر اپنے دوسرے ہم وطنوں کے بُنیادی حقوق کا احترام کریں گے!

---

(۵)

۲- اکتوبر ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کے یومِ پیدائش پر ایک تقریر نشر کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے کہا تھا ——" میں اپنے وطن پر نازاں ہوں، اپنی قومی میراث پر نازاں ہوں۔ بہت سی چیزوں پر مجھے فخر ہے۔ لیکن میں آپ کو فخر کے ساتھ نہیں بلکہ تمام تر عجز کے ساتھ مخاطب کر رہا ہوں۔ کیونکہ واقعات نے مجھے سُبک کیا ہے اور اکثر مجھے شرمندہ کیا ہے اور ہندوستان کا خواب، جو میں نے دیکھا تھا، وہ کبھی کبھی دُھندلا گیا ہے۔ میں نے ہندوستان سے محبت کی ہے اور اس کی خدمت کرنا چاہی ہے۔ اس کی جغرافیائی وُسعت کی وجہ سے نہیں، اس لئے بھی نہیں کہ ماضی میں وہ عظیم تھا، بلکہ اُس ایمان کی وجہ سے، جو مجھے آج اس میں ہے اور اپنے اس یقین کی وجہ سے کہ وہ سچائی، آزادی اور زندگی کی اعلیٰ

چیزوں کی حمایت میں ہوگا۔"

جواہر لال نہرو کی زندگی سچائی، آزادی کے تحفظ اور زندگی کی اعلیٰ چیزوں کی حمایت اور عوام کے لئے اُن کے حصول کی مسلسل جدوجہد کے لئے وقف تھی۔ یہ زندگی کی اعلیٰ چیزیں ہیں کیا؟ یہ اعلیٰ چیزیں ہیں امن، سکون، خوش حالی اور خوف وہراس سے آزادی! یہ اعلیٰ چیزیں اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک ہم میں صحیح معنوں میں ایکتا نہ ہو۔ ہم میں کردار کی بلندی ہونی چاہیئے تاکہ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُلجھنے کی بجائے بڑے مسائل اور بڑے مقاصد اپنے سامنے رکھیں۔ تنگ خیالی اور تنگ نظری چھوٹے پن کی دلیل ہیں۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہیں کہ ہمیں خود پر اعتماد نہیں۔ جسے اپنے خیال، اپنے عقیدے اور اپنے عمل پر اعتماد ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو ٹھنڈے دِل و دماغ سے سُنتا ہے۔ جسے اپنی بات کی صداقت پر یقین نہیں ہوتا، وہ اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والے کی بات سے فوراً مشتعل ہو جاتا ہے۔ یہ روّیہ غلط ہے اور اس سے جہاں فرد کی شخصیت کُچل کر رہ جاتی ہے وہاں سماج کی نشوونما بھی رُک جاتی ہے، کیونکہ بُنیادی مقاصد پسِ پُشت پڑ جاتے ہیں اور غلط مسائل سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ تنگ نظری اور تنگ

خیالی سے بڑی کوئی لعنت نہیں۔

جواہر لال نہرو مُلک اور قوم کو بڑا بنانا چاہتے تھے۔ سماجی اقتصادی اور رُوحانی ــــ ہر لحاظ سے ــــ چند آدمیوں کے دولت مند ہو جانے سے سماج بڑا نہیں ہو سکتا۔ سماج تو اُس وقت بڑا ہو سکتا ہے جب ہر شخص کو آسُودگی کی زندگی میسّر ہو، ہر شخص کو عزّت کی زندگی میسّر ہو، ہر شخص کو مادّی اور رُوحانی لحاظ سے نہ صرف ترقی کے برابر کے مواقع میسّر ہوں بلکہ ہر شخص تعلیم یافتہ اور خوش حال ہو۔ جب تک سماج میں ایک آدمی بھی دُکھی ہے، ایک آدمی بھی تنگ ہے، ایک آدمی بھی بھُوکا ہے، ایک آدمی بھی خوُد کو بے سہارا سمجھتا ہے، ایک آدمی بھی سماجی انصاف سے محروم ہے، اُس وقت تک سماج پس ماندہ ہے۔ سماج پس ماندہ ہے تو قوم پس ماندہ ہے اور قوم پس ماندہ ہے تو مُلک پس ماندہ ہے۔ اگر سماجی انصاف نہیں، اگر سماج سے نابرابری دُور نہیں ہوتی تو مُلک ترقی نہیں کر سکتا۔ جواہر لال نہرو نے مُلک اور قوم کو اُوپر اُٹھانے کے لئے منصوبہ بندی شروع کی۔ کارخانوں، چھوٹی اور بڑی صنعتوں، باندھوں، نہروں اور سڑکوں کے لئے خاکے بنانا اور ان کے لئے سرمایے، مشینوں اور تیکنیکی ماہروں کی فراہمی ہی منصوبہ بندی نہیں، یہ تو منصوبہ بندی کا ایک

جُزو ہیں۔ منصوبہ بندی ہے قوم اور مُلک کی ہر ضرورت کا اندازہ لگانا۔ اور پھر ان ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لئے ایک پروگرام کے تحت کام کرنا۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت جو تھی اور آج بھی ہے، وہ یہ ہے کہ عام آدمی کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ مُلک سے بے کاری اور بے روزگاری کا خاتمہ ہو۔ کسان، مزدُور اور پچھڑے ہوئے طبقوں کو زندگی کی وہ سہولتیں ملیں جن سے وہ محروم ہیں، یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے۔ منصوبوں کے تحت جو کام اب تک ہوا ہے اُس کے مفید نتیجے سامنے آئے ہیں، لیکن ابھی ہمیں اور بھی زیادہ محنت سے کام کرنا ہے۔ جواہر لال نہرو کو اپنے وطن سے محبّت تھی، اپنی قوم سے محبت تھی، انہیں اپنی قوم پر یقین تھا کہ وہ ملک کو خوش حال بنانے اور اس کو واقعی ایک عظیم مُلک بنانے کے لئے محنت سے کام کرے گی۔ جو قوم بلند مقاصد کے حصول کے لئے محنت سے کام کرتی ہے اُس کے پاس چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ اس طرح محنت سے کام کرکے نہ صرف مادّی لحاظ سے، بلکہ رُوحانی لحاظ سے بھی قوم ترقی کرتی ہے۔ جواہر لال نہرو نے جن بلند مقاصد کا تعیّن ہمارے لئے کیا ہے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ آئیے جواہر لال نہرو کے خوابوں کا ہندوستان تعمیر کرنے کیلئے اپنی ساری قوّتیں وقف کرنے کا عہد کریں!

---

(۶)

سُنو اے ساکنانِ خطۂ خاک
صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ بہتر
غلامی کی حیات جاوداں سے

"ہندوستان ایسے بڑے ملک میں تقریباً ہر موضوع پر مختلف قسم کی رائیں ہوتی ہیں۔ ہم سب ایک طرح سے سوچنے پر مجبور نہیں ہیں اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ مجھے آمرانہ اور غلامانہ طریقوں پر اعتراض ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ عوام اپنے ذہن اور اپنے خیالات کو جِلا دیں۔ خود سمجھیں اور آزادی سے سوچیں اور اپنے خیالات کا آزادی سے اظہار کریں۔"

جواہر لال نہرو آزادی سے پہلے اُردو تحریر و تقریر کی آزادی کے لئے لڑے تھے۔ آزادی کے بعد جب عوام نے حکومت کی باگ ڈور اُن کے حوالے کی تو انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ عوام کے بنیادی حقوق جمہوری آئین میں محفوظ کرلئے اور اس سے بڑا کام یہ کیا جمہوری نظام کو عوام کی زندگی کا ایک حصّہ بنا دیا اور اس سے بھی بڑا یہ کام کیا کہ جمہوریت کے لئے صحت مند روایات قائم کیں۔ جواہر لال نہرو جمہوریت کے سب سے بڑے معمار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جمہوریت کی بنیاد محض ووٹ کا حق نہیں، بلکہ فکر و اظہارِ خیال کی آزادی ہے اور ووٹ کا حق مؤثر اظہار خیال ہی تو ہے۔

فکر اور اظہارِ خیال کی آزادی اس وقت تک بے معنی ہے جب تک عوام کی ذہنی سطح بلند نہ ہو۔ تنگ نظری وہ کسی طرح کی ہو ذہن کو پستی کی طرف لے جاتی ہے۔ جواہر لال چاہتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ اپنے ذہن کے دروازے کھُلے رکھیں۔ ذات پات فرقے، صوبے، ریاست، مذہب اور کلچر، غرض ہر طرح کی تنگ نظری سے لوگ دُور رہیں اور آزادی کی صاف اور شفاف فضا میں اپنے ذہنوں کو نشو ونما حاصل کرنے دیں۔ چنانچہ آپ نے اس بات پر زور دیا ہے۔ "آیئے ہم جمہوریہ ہند کے شہری، سیدھے کمر سیدھی کرکے اور سینہ تان کر کھڑے ہوں اور اپنی نظر بلند

رکھیں اور قدم مضبوطی سے زمین پر جمائے رکھیں اور ہندوستان کے عوام کے میل جول، بھائی چارے سے ہم آہنگی۔ یک جہتی اور ایکتا پیدا کریں۔ سیاسی اتحاد پیدا ہو چکا ہے لیکن جو بات میں چاہتا ہوں وہ اس سے بہت گہری ہے۔ یہ بات ہے ہندوستانی عوام کی جذباتی ہم آہنگی۔ تاکہ ہم میں وحدت پیدا ہو۔ ہم ایک ہو جائیں اور ایک مضبوط قومی وحدت پیدا ہو لیکن ساتھ ساتھ ہماری رنگا رنگی، یہ تہذیبی صد رنگی باقی رہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ رنگا رنگی ہم سے چھن جائے لیکن ہمیں اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہ اُلجھیں۔ جو خاص بات ہمیں ذہن میں رکھنا ہے وہ ہندوستان کی جذباتی ہم آہنگی ہے ہمیں وقتی اشتعال سے دُور رہنا چاہیئے۔ چاہے اس کا تعلق مذہب سے ہو، جس کو غلط طریقے سے سیاست سے اُلجھا دیا گیا ہو، یا فرقہ پرستی، صوبائی تعصب یا ذات پات سے ہو۔ ہمیں اس عظیم ملک کو ایک عظیم اور طاقت ور قوم بنانا ہے عام معنوں میں طاقت ور نہیں جس کے پاس بڑی فوج اور ایسی ہی چیزیں ہوں بلکہ طاقت ور قوم بنانا ہے۔ فکر و خیال کے اعتبار سے طاقت ور، عمل کے لحاظ سے طاقت ور، تہذیب کے لحاظ سے طاقت ور اور انسانیت کی پُر امن خدمت میں طاقت ور۔"

قوم طاقتور اس وقت بن سکتی ہے۔ جب اس کے سامنے بلند مقاصد ہوں، اور وہ ان بلند مقاصد کے حصول کے لئے محنت کرے، ان تھک کوشش کرے جس کی مثال جواہر لال نہرو کی زندگی ہے، انہوں نے بار بار اس بات کو دُہرایا کہ ہندوستان کو ایک مہان ملک بنانے کے لئے ہمیں خود کو بڑا بنانا ہوگا تاکہ ہم اس بڑے کام کے اہل ہو سکیں۔ ہم صرف یہ سوچ لینے سے بڑے نہیں ہو سکتے کہ ہم بڑے ہیں۔ ہم صرف اپنے عمل سے اور اپنے کردار سے بڑے ہو سکتے ہیں۔ تعصب اور تنگ نظری کردار کے سب سے بڑے عیب ہیں۔ یہ صرف ایک فرد کے دشمن نہیں۔ بلکہ سارے سماج، ساری قوم اور سارے ملک کے دُشمن ہیں۔ جواہر لال نہرو نے ہمیں اس بات کی تلقین کی ہے کہ ہمیں انتشار کے اُن رجحانات کو دبانا چاہیئے جو موقعہ ملنے پر اُس ملک میں سر اُٹھاتے ہیں۔ انتشار کے یہ رجحانات کبھی فرقہ پرستی کے روپ میں آتے ہیں۔ کبھی مذہب کا لبادہ اوڑھے سیاست کے میدان میں آتے ہیں اور کبھی فرقہ وارانہ منافرت کی شکل میں ابھرتے ہیں۔ ہمارے سامنے تاریخ کا سبق ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح متواتر، اپنی خوبیوں اور اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود ہم دوسری قوموں سے پچھڑ گئے ہیں اور باہمی اتفاق اور رواداری کے فقدان کی وجہ سے سارے ملک کو نقصان پہنچا۔

جواہر لال نہرو نے قوم میں - قوم کے ہر فرد میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا - لیکن خود اعتمادی کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنی خامیوں کو بھی خوبی سمجھنے لگیں - اگر ایسا ہوا تو سماج پر اس کا بُرا اثر پڑے گا - بعض لوگوں کا ایک رویہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو درست اور اپنی ہر چیز کو اعلیٰ سمجھتے ہیں - یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے - جہاں ہر چیز اعلیٰ اور مکمل ہو وہاں کسی اصلاح یا ترقی کی گنجائش نہیں ہوتی - جواہر لال نہرو نے نئے ہندوستان کے خواب دیکھے تھے اور وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل رہے تھے لیکن انہوں نے خواب حقیقت کو نکھارنے کے لئے دیکھے تھے وہ حقیقت پسند تھے، کیونکہ ہر باعمل انسان حقیقت پسند ہوتا ہے - حقیقت کی طرف آنکھیں بند کر لینا اُن کا شیوہ نہیں تھا چنانچہ انہوں نے تلخ باتیں بھی کہی ہیں - یہ بات دوسری ہے کہ اُن کے منہ سے تلخ باتیں بھی پھولوں کے رس میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھیں - اُنہوں نے کہا ہے :-

"ہم اچھی طرح سے اپنی خامیوں کو سمجھتے ہیں - یہ خامیاں دوسرے ملکوں کی خامیوں سے بڑی ہیں - اگر ہمیں اس حقیقت کا احساس نہیں تو ہم کبھی بڑھ نہیں سکتے - دنیا میں اور بھی ملک روحانی اعتبار سے ہم سے بڑے ہیں - بعض حیثیتوں سے ہم بھی بڑے ہوں گے - میں نہایت ادب سے کہوں گا کہ یہ بات

مجھے پسند نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور یہ سوچتے رہیں کہ ہم روحانی طور سے بڑے ہیں حالانکہ مادی طور سے ہم بڑے نہیں ہیں۔ اگر ہم روحانی لحاظ سے واقعی ترقی کرتے ہیں تو مادی چیزیں اہمیت نہیں رکھتیں"۔

روحانی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا اور اپنے سے مختلف رائے رکھنے والے کو اپنا نظریہ پیش کرنے کا موقعہ دینا۔ اشتعال انگیزی صرف اُن کا شیوہ ہوتا ہے جو روحانی لحاظ سے پسماندہ ہوتے ہیں کیونکہ انہیں خود پر اعتماد نہیں ہوتا جہاں روحانی پسماندگی ہو وہاں چھوٹی چھوٹی باتیں اختلاف کا سبب بنتی ہیں اور اختلاف سے نفاق اور نفاق سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اور بڑے مقاصد نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جواہر لال نہرو نے ہمیں اپنی خامیوں پر قابو رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اُن کے نزدیک ہماری بڑی خامی یہ ہے کہ ہم انتشار کی قوتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کی بنیادی ایکتا ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ہم فروعی باتوں سے مشتعل ہو جاتے ہیں۔

"ثانوی معاملات ثانوی معاملات ہیں اور اپنی قوم سے بے پناہ محبت تھی اور اس محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے عوام کو حکومت میں برابر کا شریک کیا۔ ان کی

زندگی کا صرف ایک مقصد تھا۔ ملک اور قوم ۔ اور انسانیت کی خدمت ۔ اور یہ خدمت صرف جمہوریت سے ممکن تھی ۔ جمہوریت اور اشتراکی نظام دونوں ایک ہی تصویر کے رُخ ہیں کیونکہ جمہوریت میں اقتدار کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں اور جب نظام حکومت نمایندوں کے توسط سے عوام کے ہاتھوں میں ہو تو اشتراکی سماج کا قیام ناگزیر ہو جاتا ہے ۔ یہاں جمہوریت کی سب سے بڑی مشکل آجاتی ہے ۔ کیا وہ لوگ اپنے مفاد خصوصی کو خود چھوڑیں گے جنہیں نچلے طبقوں سے زیادہ مراعات حاصل ہیں ۔ یہ مسئلہ جواہر لال نہرو کی فکر کا مرکز بنا ۔ "ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ جمہوریت اور اشتراکیت کو ایک دوسرے سے کیسے ملائیں ۔ پُر امن اور قانونی طریقوں سے یہ مسئلہ ہندوستان نے اپنے سامنے رکھا ہے ۔ یہ بہت مشکل مسئلہ ہے ۔ پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ ہم کافی حد تک اعتماد کے ساتھ اس کا سامنا کر سکتے ہیں ۔ ہم نے ماضی میں بہت سی چیزیں حاصل کیں جو مشکل تھیں اور اس بات کی یقیناً کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے بھی حاصل نہ کر سکیں ۔ ہم کسی زور زبردستی سے یہ حاصل نہیں کر سکتے ۔ اس کے لئے ہمیں عوام کا اشتراک حاصل کرنا ہوگا ۔"

جواہر لال نہرو نے ہمیشہ عوام کو اعتماد میں لیا ، اور عوام نے ہمیشہ ان پر اعتماد کیا ۔ آج بھی جب وہ ہمارے درمیان

نہیں ہیں، ہمیں ان کی باتوں پر، ان کے اصولوں پر اعتماد ہے۔ انہیں یہ اعتماد تھا کہ ہم اُن کے اصولوں پر چلیں گے۔ ہم ان کے اصولوں پر چلیں گے اور ہندوستان کے لئے جو ارفع و اعلیٰ منزل انہوں نے طے کی تھی۔ ہندوستان کو ہم اس منزل پر پہنچائیں گے ؞

---

(۷)

جواہر لال کے لئے جمہوریت کوئی کتابی یا ضابطے کی بات نہیں تھی۔ اگر جمہوریت حقیقی نہ ہو۔ صرف دکھاوے کی ہو اور اس میں حکومت عوام کے چنے ہوئے نمایندوں پر مشتمل نہ ہو اور عوام کے نمایندوں کو جوابدہ نہ ہو تو وہ جمہوریت نہیں۔ جمہوریت کے لباس میں آمریت ہے جواہر لال نہرو نے ہمیشہ اس بات پر نظر رکھی کہ ہندوستان [illegible] نہ ہونے پائے۔ آٹھ سال قبل پارلیمانی جمہوریت کے بارے میں پہلے کل ہند سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا :-

"پہلے جمہوریت سے صرف سیاسی جمہوریت مُراد لی جاتی تھی۔ موٹے طور سے وہ اس خیال کی ترجمانی کرتی تھی کہ ہر انسان کو ایک ووٹ دینے کا حق ہو۔ یہ بڑی واضح سی بات ہے کہ جو شخص کچلا ہوا ہو

اور فاقے کر رہا ہو اس کے لئے ایک ووٹ بذاتِ خود کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسا شخص ووٹ سے کہیں زیادہ ایک وقت کی روٹی کو اہمیت دیگا۔ اس لئے سیاسی جمہوریت بذات خود کافی نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ اس سے اقتصادی جمہوریت حاصل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ زندگی کی اچھی چیزیں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو میسر ہونا چاہئیں۔ اور نابرابری ختم ہونا چاہیئے۔"

سیاسی جمہوریت اُن کے نزدیک انجام نہیں۔ بلکہ ایک ذریعہ تھی۔ اس سیمینار میں انہوں نے کہا تھا "ہم جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں۔ میں اپنے لئے کہہ سکتا ہوں کہ میں اس میں اس لئے یقین رکھتا ہوں کیونکہ سب سے پہلے یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے صحیح ذریعہ ہے اور پُرامن ذریعہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جمہوریت اس دباؤ کو ہٹاتی ہے جو حکومت کے دوسرے نظام فرد پر عاید کرتے ہیں۔ دوسرے نظام میں جو پابندیاں حکومت زبردستی لوگوں پر ٹھونستی ہے۔ جمہوریت میں خود نظمی کے طور پر عوام اپنے آپ کو اُن کا پابند کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ایک نئی قوم اُبھر رہی ہے اور ایک نئی تہذیب جنم لے چکی ہے۔ جس کے روشن مستقبل کی ضمانت وہ جمہوری قدریں ہیں جن کی آبیاری جواہر لال نہرو نے کی ہے۔ انہوں نے ملک اور قوم کو جو کچھ دیا ہے۔ اُس کو مختصر طور سے بھی بیان کرنے کے لئے ایک زمانہ چاہیئے۔ کیونکہ اُن

کی زندگی کا ہر لمحہ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ اُن کی سرکاری قیام گاہ نئی دہلی میں تھی کیونکہ وہاں پارلیمنٹ ہے۔ اور حکومت کے دفاتر ہیں۔ لیکن اُن کا دل دیہاتوں میں تھا کیونکہ ہندوستان کی زیادہ آبادی دیہاتوں میں ہے۔ شہروں میں کچھ اچھی سڑکیں خوبصورت پارک اور بڑے کارخانے ترقی کی نشانی ہونے کے باوجود جواہر لال نہرو کے لئے کافی نہیں تھے۔ وہ گاؤں کی زندگی میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور اس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اُن کا ترقی کا تصوّر یہ تھا کہ گاؤں کی زندگی سُدھرے۔ کھیتی باڑی سائنسی طریقوں سے ہو۔ تاکہ پیداوار بڑھے۔ اس سے نہ صرف غذائی مسئلہ حل ہوگا۔ بلکہ کسانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اُن کا ترقی کا تصوّر یہ تھا کہ ہندوستان میں صنعتی عہد آئے۔ آج ہندوستان صنعتی لحاظ سے جاپان کو چھوڑ کر ایشیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ حالانکہ ابھی ہمارے صنعتی دَور کو شروع ہوئے کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا ہے

ہندوستان کو جواہر لال نہرو کی سب سے بڑی دین منصوبہ بندی اور منصوبوں کے تحت ترقی ہے۔ ترقی یہ نہیں ہے کہ باندھ بنے ہیں۔ ریل کے کارخانے بنے ہیں۔ یا فولاد کے کارخانے بنے ہیں۔ ترقی یہ ہے کہ عام آدمی کا معیار زندگی بلند ہوا ہے۔ بڑے کارخانوں کے ساتھ ساتھ شہروں اور گاؤں میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بڑھاوا دیا گیا ہے۔ امدادِ باہمی کی انجمنوں کے

ذریعے سے لوگوں کو زیادہ کاروبار اور زیادہ آمدنی کے مواقع میسر ہوئے ہیں منصوبوں کے تحت جو کام ہوئے ہیں اُن کے فائدے عام آدمی تک پہنچے ہیں۔ یہ فائدے صرف آمدنی میں اضافہ کی صورت میں نہیں ہوئے بلکہ بڑے اور چھوٹے ہسپتال اور ڈسپنسریاں لاکھوں کی تعداد میں کھلی ہیں۔ اسکول اور لائبریریاں اور تجربہ گاہیں اور تربیتی ادارے لاکھوں کی تعداد میں کھلے ہیں اور کھل رہے ہیں۔ تعلیم اب صرف اعلیٰ اور درمیانہ طبقہ تک نہیں رہی بلکہ عام مزدور اور کسان کے بچے بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان کا سماجی اور معاشی نقشہ بدل رہا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جواہر لال نہرو معیشت کو سرے سے بدلنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے اشتراکی سماج اور فلاحی ریاست کا آدرش تھا اور وہ ہندوستان کو اس آدرش کی جیتی جاگتی تصویر بنانا چاہتے تھے۔

جواہر لعل نہرو کو جو محبت ہم سے تھی اور جو عقیدت اُس عظیم ہستی سے ہم کو ہے۔ ان کا تقاضہ ہے کہ ہم اشتراکی سماج اور فلاحی ریاست کا قیام اپنی زندگی کا مقصد سمجھیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جی جان سے محنت کریں۔ فلاحی ریاست سے کم کوئی چیز جواہر لال نہرو کے شایانِ شان یادگار نہیں ؛

یکم جولائی ۱۹۶۴ء

(۸)

انسان کی عظمت اور کامیابی کا یہ معیار ہرگز نہیں کہ اس نے دُنیا سے کیا حاصل کیا؟ انسان کی عظمت اور کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اس نے دُنیا کو کیا دیا؟ عالم، سائینس دان، فلسفی اور دانشور اسی پیمانے سے ناپے جاتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کو اس کسوٹی پر پرکھیئے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے قوم کو ایک نئی زندگی دی۔ مُلک کو وہ نظامِ حکومت دیا جو سارے نظاموں میں بہترین ہے اور دُنیا کو پُرامن بقائے باہم کا راستہ دِکھایا اور اس طرح اسے ہولناک ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچائے رکھا۔ مُلک اور قوم ہی کی تاریخ پر نہیں عالمی تاریخ پر اُن کی بہت گہری چھاپ ہے۔ ان کی زندگی مُلکی اور بین الاقوامی تاریخ کا ایک بہت اہم باب ہے۔ حکومتِ ہند نے ایک خاص گزٹ میں جواہر لال نہرو کی وفات کو گاندھی جی کی شہادت

کے بعد سب سے بڑا سانحہ بتایا ہے۔ سیاہ حاشیے کے گزٹ کی خاص اشاعت میں کہا گیا ہے کہ نہرو جتنے ہندوستان کے عوام کے لئے تھے اتنے ہی عالمِ انسانیت کے لئے تھے۔ آج ساری دُنیا اس عظیم ہستی کے اُٹھ جانے کا ماتم کر رہی ہے۔ نہرو کی ساری زندگی نہ صرف قومی آزادی اور یک جہتی کے لئے بلکہ عالمی امن اور ترقی کے آدرشوں کے لئے بھی وقف تھی۔ وہ جنگ کے خلاف اور مکمل ترکِ اسلحہ کے لئے ان تھک کوششیں کرتے رہے۔ انہوں نے غلام مُلکوں کی آزادی کے لئے آواز اُٹھائی اور ان کی جدوجہدِ آزادی کا ساتھ دیا۔ نہ صرف اپنی قوم کو بلکہ دُنیا کو خوف اور بھُوک سے نجات دِلانے کے لئے مُسلسل کام کیا۔ انہوں نے فوجی دھڑے بندیوں کو عالمی امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھا اور ان کی مخالفت کی۔

ان کا عالمی تصوّر کبھی دُھندلانے نہیں پایا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے ایشیائی تعلقات کانفرنس بُلائی۔ وہی اس کے رُوحِ رواں بھی تھے۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے امن کے پانچ اصول مُرتب کئے یہ پنچ شیل کے اصول ہیں۔ دوسری بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں جنہوں نے ۱۹۵۵ء میں بانڈونگ کانفرنس کے لئے راستہ ہموار کیا۔ انہوں نے دُنیا کو ناطرف داری کا نظریہ دیا۔ جس کو ۱۹۶۱ء میں بلگراڈ کی ناطرف دار قوموں کے سربراہوں کی میٹنگ نے قبول کیا۔

جواہر لال نہرو اقوام متحدہ اور اس کے محضر کے اصولوں کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ عزیز رکھتے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے پیرس میں تیسری جنرل اسمبلی کے سیشن سے خطاب کیا۔ آخری بار وہ ۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ میں گئے۔ یہاں انہوں نے ایک نہایت ہی اہم قرارداد پیش کی۔ اس میں انہوں نے عالمی امن اور بڑی طاقتوں کے رہنماؤں کے ملنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ وہ حکومت کے پہلے سربراہ تھے جنہوں نے اگست ۱۹۶۳ء میں تین ایٹمی طاقتوں کے درمیان ہونے والے ایٹمی تجربوں پر محدود پابندی کے معاہدے کی حمایت کی۔

پانچ سال پہلے برطانوی فلسفی برٹرنڈ رسل نے کہا تھا "انسانی تاریخ کے اس نازک وقت میں نہرو دانش مندی اور امن کی حمایت میں کھڑے ہیں۔ شاید وہی خوف کی تاریکی سے ہمیں خوشی کی صبح تک لے جائیں گے!"

پانچ سال بعد نہرو کی وفات کی خبر سُن کر امریکی صدر نے کہا۔ "شاید انہوں نے انسان کی امن کی تمنا کو دُنیا کے کسی بھی دوسرے رہنما سے زیادہ اور مؤثر اظہار دیا ہے۔ یہ ہمارے عہد کا سوال ہے۔ دُنیا کو جنگ کے خطرے سے نجات دینے کے لئے ان کی بے باک جدوجہد نے ساری انسانیت کی خدمت کی ہے۔ امن گاندھی کی طرح جواہر لال نہرو کا بھی آدرش تھا۔ دُنیا کو یہی ان کا پیغام تھا۔

جنگ کے بغیر دُنیا سے بہتر کوئی اور یادگار ان کے شایانِ شان نہیں
یہ میرا پُرخلوص یقین ہے کہ دُنیا کے دانش وروں کو ان کے آدرش
کو حقیقت بنانے کے لئے خود کو وقف کرنا چاہیئے۔

ایک عہد

راجندر سنگھ بیدی

پنڈت جواہر لال نہرو چلے گئے۔ ہمیں اُن سے یہ اُمید نہ تھی۔

انسان میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ حُسن اور خوبصورتی کو وقت کے ایک لمحے میں جکڑ لینا چاہتا ہے۔ جیسے کوئی بھی لمحہ اپنے آپ میں دائم و قائم رہنے کی صلاحیت یا قدرت رکھتا ہو۔ انسان خود فریبی کے جال سے اُس وقت نکلتا ہے جب اُسے اپنے سامنے وقت کی وہی اکائی ٹوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایک بڑے صدمے کے ساتھ اُس پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ حسن تو کچھ بھی نہ تھا۔ اور پھر حُسن ہی تو سب کچھ تھا۔ کیونکہ اس نے انسان میں ایک ایسے جذبے کو بیدار کر دیا جسے عشق کہتے ہیں اور جو کبھی نہیں مرتا، کبھی فنا نہیں ہوتا۔

پنڈت جواہر لال نہرو سراپا حُسن تھے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ایک خوبصورت آدمی تھے جس کا تصور ہو رہیں، تو ایک طرف بچے بوڑھے

سبھی کیا کرتے ہیں بلکہ ایک ایسا ذہن بھی پایا تھا جو حسن کو اور بھی صیقل کر دیتا ہے۔ اس پر طرۂ آگہی جو انسان کو پیغمبروں کی صف میں جا کھڑا کرتی ہے۔ پنڈت جی کی زندگی، اُن کے حصول، اُن کی قربانی، ہندوستان اور کُل عالم کو ان کی دین کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہمارے لئے یہ تھا کہ اُن کے قدم اس دھرتی میں دُھنسے ہوئے تھے اور سر افلاک میں تھا۔ وہ بامن اوتار تھے بلکہ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمالہ کی چوٹی پر کھڑے ہیں جہاں سے نہ صرف وہ اپنے دیش بلکہ دُنیا بھر کو دیکھ رہے ہیں اور اُن اثباتی قدروں کی پاسبانی کر رہے ہیں جو دُنیا بھر کے فکری راہنماؤں نے انسان اور اس کی اولاد کو ورثے میں دیں۔ وہ ایک طرف تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تاریخ کے دُھندلے ادوار میں ہمارے آباد اجداد پہ کیا گزری دوسری طرف وہ ایک رؤیہ درشٹی، ایک روشن ضمیری میں یہ بھی جان رہے ہیں کہ آنے والے کل کو انسان کی اولاد پہ کیا بیتنے والی ہے وہ کائناتی سانحۂ عظیم دیکھ رہے ہیں اور تھرمو نیوکلیائی کا محرک ہیں۔ انہوں نے دیوتاؤں کے ساتھ آبِ حیات پیا ہے تو سقراط کے ساتھ زہر آب بھی۔ جہاں وُہ اُپنشدوں اور میمانسوں کی دین سے واقف ہیں۔ وہاں وُہ بابل، نینوا، سفر یونان اور NCA : اور ANZEC تہذیبوں کا جلوس بھی اپنی نظروں کے سامنے

سے گذرتے دیکھ رہے ہیں اور یہ بھی جان رہے ہیں کہ ایک کوبالٹ بم کے پھٹنے اور اس کے سلسلہ وار ردِ عمل سے ہماری اس پیاری زمین کی کیا شکل نکلنے والی ہے۔

اقبال نے ترانۂ ہندی میں کہا تھا ؎

یونان و مصر و روما، سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اگرچہ یہ دُرست ہے کہ ہمارے معاشرے کی کسی اندرونی صحت کی وجہ سے ہندوستان کا نام و نشان باقی رہ گیا۔ اگرچہ بہت سی تہذیبیں آئیں اور منہ کے بل گریں۔ مگر اس باقی باقی سے پنڈت جی کی تسلّی نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ پنڈت جی نے تاریخ عالم کے پس منظر میں ہندوستان کو دوبارہ دریافت کیا تو بہت سی حقیقتیں اُن پر روشن ہوئیں۔ اُن میں یہ یقین پیدا ہوا کہ قدیم تاریخ اور کلچر کا گہوارہ یہ مُلک، اپنی رُوحانی اور اثباتی قدروں کے ساتھ، ترقی یافتہ ملکوں اور قوموں کی مدد سے نہ صرف اپنی پس ماندگی، غربت اور افلاس کو دُور کر سکتا ہے، بلکہ سب کے دوش بدوش اور آگے بڑھ کر دُنیا بھر کو وہ راستہ دِکھا سکتا ہے جو امن اور آشتی کا راستہ ہے اور جو انسانی فلاح کی منزل کو جاتا ہے۔ جہاں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنے بچھڑے ہوئے مُلک کے لئے حاصل کرنا چاہتے تھے وہاں

وہ یہ بھی بتانا چاہتے تھے کہ انسانی ترقی معکوس ہو گی، اگر ہم اخوت، مساوات، اخلاق اور سب سے بڑھ کر وجدان پر اپنا ایمان نہ لائیں گے۔

پچھلے دنوں اسی سرینگر میں میری ایک باخبر غیر ملکی خاتون سے مُلاقات ہوئی۔ اُنہوں نے ملتے ہی پنڈت جی کی نکتہ چینی شروع کر دی کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق گاندھی جی کے شِشیہ نے تشدّد کا استعمال کر کے گوا کو ہندوستان کا حصہ بنا لیا تھا۔ میں ایک ناسمجھ آدمی کی طرح سامراج اور نوآبادیاتی مُلکوں کے بارے میں پنڈت جی کے رویّہ کی باتیں کرنے لگا۔ اور وہ ایک بچے کی طرح ہٹ کرتی رہیں۔ جبھی مجھے پتہ چلا کہ ہم دونوں ایک ہی جذبے سے باتیں کر رہے ہیں اور وُہ پنڈت جی کے لئے ایک بے پناہ عقیدت اور محبّت کا جذبہ تھا۔ جس میں وہ خاتون اہنسا کے معنی نہ سمجھ سکتی تھیں۔ اور میں ہنسا کے معنوں سے عاری تھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گوا پر کئے اس عمل میں کہیں امریکہ کے آزادی کے اسٹیچو پر دراڑیں آ گئی ہیں یا کوئی بہت بڑا صنم، جس کی وہ پرستش کرتی آئی ہیں، اپنے مقام سے ہِل گیا ہے۔ اور مجھے یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے میرے رام چندر چودہ سال کے بن باس کے بعد اجودھیا لوٹے ہیں اور اس وقت وہ ہانگ کانگ میکاؤ وغیرہ کی باتیں کر رہے ہیں جنہیں اب تک سامراجیوں نے اپنے تسلّط میں رکھا ہوا

ہے اور وہ ملک، جو انقلاب کا واحد علم بردار ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے۔ کسی مصلحتِ دروغ آمیز کے تحت اسے برداشت کئے جا رہا ہے۔

کچھ ایسا ہی، بلکہ اس سے بھی گہرا تجربہ مجھے روس میں ہوا۔ جہاں میں ایک بار افریقی ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے سلسلے میں گیا اور دوسری بار انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی کی نیشنل کونسل کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے۔ میرے ساتھ میرے صدر بمبئی کے ڈاکٹر بالیگا بھی تھے۔ جو پنڈت جی ہی کی طرح کے مستعد جاں فروش محبِ وطن تھے اور جن کی پنڈت جی سے چند ہی روز پہلے وفات ہوئی۔ ہم روس کی دور افتادہ جمہوریتوں میں گئے۔ وہاں کے نسبتاً کم تعلیم یافتہ انسان جو یہ بھی نہ جانتے تھے کہ ہندوستان دنیا کے نقشے پر کہاں ہے، پنڈت نہرو کے نام سے واقف تھے۔ ہمیں اپنے ملک اور اپنی قوم کا نام بتانے کے لئے اپنے آپ کو نہرو کہنا پڑتا تھا۔ جب ان کی آنکھوں میں چمک دیکھنے کے قابل ہوتی تھی اور وہ سمجھ جاتے تھے۔ پھر وہ ایسی محبت اور اس یگانگت کا ثبوت دیتے تھے جو تالستائی کے ناولوں اور چیخوف کی کہانیوں کا MUZHIK ہی دے سکتا ہے۔ وہ اپنا دل نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیتے تھے اور بار بار پنڈت جی کی صحت کے جام پیتے پلاتے تھے۔ وہ جام، جو

اب نہ ٹکرائیں گے ... ... اس بات کا تجربہ ہمیں ہی نہیں، ہمارے دوسرے ہم وطنوں کو بھی ہوا ہے جو مشرقی یا مغربی ممالک میں گئے ہیں۔ دُنیا بھر کے عوام جانتے تھے کہ پنڈت نہرو کا ہندوستان امن کی جدوجہد میں ان کے شانہ بشانہ ہے۔ کیا سویز کا مصر اور کیا کانگو، کیا انڈونیشیا کی "مرڈیکا"، کیا کینیا کی "اہرو" سب کی آواز میں پنڈت جی کی آواز ملی ہوتی تھی۔ پنڈت جی عالم کے لاکھوں کروڑوں مظلوموں اور ستم زدوں کی صدا تھے اور جہاں کہیں بھی کوئی سامراجی طاقت محکوموں کو دباتی تھی تو کیا اس مُلک کے عوام اور کیا راہی ایسے اندھیرے میں ہندوستان کی طرف دیکھتے تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو ایک مشعل تھے جو دُنیا بھر میں کہیں سے بھی دکھائی دیتی تھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو میں جہاں مشرق اور مغرب کے تقابل کی صلاحیت تھی وہاں مختلف النوع قومی اور غیر قومی خیالات اور فلسفوں کی تحلیل کی قوت بھی۔ اُن سے زیادہ دردمندی سے کوئی اس بات سے واقف نہ تھا کہ ہم نے اپنے اتنے بڑے اور عظیم ورثے کو بے ہودہ رسموں اور رواجوں میں کھو دیا ہے اور متحد ہو کر ایک جامع قومیت اور اس کا ٹھوس کردار بنانے کے بجائے ذات پات صوبائی اور بین الصوبائی تفرقات میں پڑ کر اپنی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہے

ہیں۔ ایک طرف اپنے اخلاقی اور رُوحانی انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو دوسری طرف پیسے کے ابوالہول کی پرستش اور اسے حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی ذریعہ روا رکھتے ہیں۔ اپنی تندرستی کے لئے پنڈت جی یوگ کی ورزش کیا کرتے تھے۔ لیکن یوگ کے

"OBSCURANTIST" حصے کی طرف انہوں نے کبھی توجّہ نہ دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے اپنی وصیّت میں صاف کہہ دیا کہ میری راکھ اور میری استھیوں کو ہندوستان کے کھیتوں میں گرا دو۔ کیونکہ وہی ہماری عبادت گاہیں ہیں۔ بھاکرہ ننگل اور دوسرے باندھ ہی جدید ہندوستان کے مندر ہیں۔ ان کا طرزِ عمل سوامی ودیکانند کا سا تھا۔ جنہیں پنڈت جی اپنے طریقے سے مانتے تھے اور جنہوں نے امریکہ جاکر وہاں کے لوگوں سے کہا۔ ہمارے دیش میں مشنری لوگ مت بھیجیئے۔ رُوحانیت ہمارے ہاں بہت ہے مگر ہمارے لوگ بھُوکے مر رہے ہیں۔ وہ افلاس زدہ ہیں۔ انہیں ہسپتالوں کی ضرورت ہے۔ سکولوں کی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے کی ضرورت ہے۔ جب اُن کا پیٹ بھر جائے گا تو وُہ نہ صرف خُود خدُا کو دیکھ سکیں گے بلکہ آپ کو بھی دِکھا سکیں گے۔ کیونکہ اس کو پلنے کی آپ کو اشد ضرورت ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو ماؤں کے فرزند، عورتوں کے مثالی مرد، بچوں کے چاچا، دانش وروں کے رفیق اور رہنماؤں کے رہنما تھے۔

اُن کے بنگلے پر عدلِ جہانگیری کا گھنٹہ تھا جو ظلم و تقدیر کے شکار لوگوں کو دکھائی دیتا تھا اور جس کی آواز سُنتے ہی وہ باہر چلے آتے تھے۔ اُنہیں اپنے کُتے "مدھو" سے پیار تھا اور اپنے مالی "جنگلی" اور اُن کے بارہ بچوں سے دلچسپی تھی۔ کوئی بھی اُن تک پہنچ سکتا تھا۔ کوئی بھی اپنی آواز اُن تک پہنچا سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی بات کی تلاش میں رہتے تھے کہ مُلک کے ہزاروں مسئلوں کے بارے میں کوئی انھک سے سوچنے والا اُن تک میمورنڈم بھیج دے جس پر وہ فوراً عمل کرنے کو تیار تھے۔ جب ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس بات کا افسوس سے ذکر کیا جائے گا کہ مُلک کے دانش وروں نے ان کا اس حد تک ساتھ نہ دیا جس حد تک پنڈت جی چاہتے تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو حُسن کے اس مجسمے نے خود ٹوٹ کر ہمیں وہ عشق دیا جسے ہم آج کل کا ہندوستان کہتے ہیں۔ اور جو آج بھی دُنیا بھر کی نظروں کا مرکز ہے۔ یہ اُن کی اتنی بڑی دین ہے کہ میں پنڈت جی کے سلسلے میں محرم کا سماں پیدا کرنے کا قائل نہیں اور نہ اس خلا کو مانتا ہوں جس کی طرف ہر سمت سے اشارے ہو رہے ہیں۔ آپ کو غم ہے، مجھے بھی ہے۔ مگر ——— مرد رویا نہیں کرتے اور ہندوستان کے لوگوں کو مرد ہونا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب کسی بڑے باپ کے بیٹے کا تعارف اُس کے باپ کے نام سے کروایا جائے تو وہ شروع میں خوش ہوتا

ہے لیکن آخر میں چڑنے لگتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے باپ سے الگ اُس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ یہاں تک کہ اسے اپنے باپ کے نام سے نفرت ہو جاتی ہے۔ آخر وہ ایک اَن تھک محنت کے بعد ایک کڑی جد وجہد کے ساتھ خُود اپنے لئے اپنا مقام پیدا کرتا ہے۔ خُود بڑا آدمی ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے باپ کا نام فخر سے لیتا ہے۔ ہمیں بھی ضرورت ہے کہ اتنے بڑے باپ کے بیٹے کہلانے اور اس پر فخر اور ناز کرنے کے لئے خود کچھ کر کے دکھائیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہمارے اہل ہوئے، ابھی ہمیں ان کے اہل ہونا ہے۔ پنڈت جی جہاں بھی ہوں گے اپنے فرزندوں سے یہی چاہیں گے۔ اُن کی شان میں سب سے بڑا خراج یہی ہو گا۔ آپ کو رونا ہے تو لہو روئیے، آنسو نہیں۔

وہ راکھ اور استھیاں جو ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہندوستان کے کھیتوں پر چھڑکی جائیں گی، ان کا ایک شمّہ میں نے ابھی سے اپنے دل کی کھیتی پر چھڑک لیا ہے اور میں اس بات کی پُوری کوشش کروں گا کہ ایسا ادب پیدا کروں جو ہندوستان کو دُنیا بھر کے ادبی طور پر ترقی یافتہ مُلکوں کی صف میں جا کھڑا کرے۔ ایسا ادب، جس کے لئے پنڈت جی نے ہماری زمین کو سرسبز و شاداب کر دیا ہے اور جو ادب مشرق اور مغرب کے سنگم پر کھڑے ہندوستان اپنے رُوحانی اور ثقافتی ورثے اور نئی قدروں کی بنا پر کُلِ عالم کو دے سکتا ہے۔ میں نے بڑے عجز اور

پنڈت جواہر لال نہرو کے تئیں اپنی اس شردھانجلی کے ساتھ آج سے یہ عزم کر لیا ہے اور آپ سے بھی یہ توقع رکھتا ہوں کہ زندگی کے اپنے اپنے شعبے میں کوئی ایسا ہی عزم کریں گے۔

میرِ کارواں

عبدالقادر سروری

ہمارا میرِ کارواں اب ہم میں نہیں رہا۔ زندگی میں اس کے بغیر ایک خلا نظر آرہا ہے۔ غلامی سے لے کر آزادی تک اور سیاسی آزادی سے لے کر معاشی اور سماجی تنظیم اور خوش حالی کی سر منزل تک کتنے دشوار گذار مرحلے تھے جن کو اپنے میرِ کارواں کے ساتھ ہم نے طے کیا؟ اور ابھی قافلے کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کتنی پُر پیچ راہوں سے گذرنا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے؟ ان راہوں سے گذرنے کے لئے اپنے رہبر کی ہم کو کتنی ضرورت تھی۔ اُس کی رہنمائی پر ہم کو کتنا بھروسہ تھا؟ راہروانِ راہِ وفا کی نظریں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ کتنا اعتماد قوم کو اس سالکِ راہ سیاست و صداقت پر تھا۔ لیکن افسوس کہ مشیت نے اس کی خدمات سے ہم کو محروم کر دیا۔ پندرہ بیس برس کا عرصہ ایک عظیم الشان قوم کی زندگی میں ہوتا ہی کتنا ہے؟ اس مختصر عرصہ میں اُس میرِ کارواں نے ہم کو کہاں

سے کہاں پہنچا دیا؟ اقوامِ عالم میں، آج سے پندرہ برس پہلے، ہمارا کیا مقام تھا؟ لیکن آج بھارت نے وہ ساکھ پیدا کرلی ہے کہ کسی پہلو سے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چشمِ بصیرت اس کو میرِ کارواں کی پُر خلوص رہنمائی کے معجزہ کے سوا اور کیا سمجھ سکتی ہے۔

کتنی توقعات تھیں جو رہروانِ قافلہ نے اپنے محبوب میرِ کارواں سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن افسوس کہ نظریں اسے ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ ہم میں نہیں رہے۔ کیا اُس رہبرِ تیز گام کو ہم رہان ست عناصر کی ہم قدمی نہیں بھائی؟ ابھی بہت سی منزلیں ہمارے سامنے ہیں، نئے مرحلے آئیں گے، ابھی سفر دُور دراز ہے، نئے میرِ کارواں پیدا ہوں گے اور قوم کی کشتی کی ناخدائی کریں گے، لیکن جو جگہ جواہر لال کے اُٹھ جانے سے خالی ہوگئی ہے وہ اب پُر نہیں ہو سکے گی۔

لیالی و ایام کی ان سترہ منزلوں کے اس پار، یہ قافلہ کھڑا ہوا، جب طے شدہ راہوں کے پیچ و خم پر نظر ڈالتا ہے تو کبھی چھوڑی ہوئی راہوں کے لق و دق صحراؤں، اوگھٹ گھاٹیوں کے نشیب و فراز اور پُر خطر وادیوں کو دیکھ کر جی دہل جاتے ہیں، اور ان مرحلوں سے صحیح و سالم گذر جانے پر اہلِ قافلہ کے دِل بارگاہِ ایزدی میں جھک جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جب ان پُر فضا مرغزاروں پر نظر پڑتی ہے جن میں میرِ کارواں کے ساتھ اہلِ قافلہ نے بہت سے خوش گوار لمحات گذارے تھے تو دل

میں ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے۔ وہ مناظر، وہ سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے تو دِل مسوس کر رہ جاتا ہے کہ افسوس آج وہ میر کارواں ہم میں نہیں رہا!

یہ دِل خراش حقیقت اب روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ ہم کو اب میر کارواں کے بغیر اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ انہوں نے جو نقشِ قدم چھوڑے ہیں اُن پر چلنا ہے۔ اس حقیقت کا جب شعور ہوتا ہے تو زندگی بے سہارا معلوم ہونے لگتی ہے۔ جو یادگار ماہ و سال ہم اس پر اعتماد کرتے اور اس پر ناز کرتے گذارے ہیں اُن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ ہمارے خیالوں میں بسا ہوا نظر آتا ہے اور روحوں پر چھایا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آگے سفر میں ہر موڑ پر اس کی پرچھائیں نظر آئیں گی۔ اور وہی دشوار گذار مرحلوں میں ہم کو آگے اور آگے ہی بڑھاتی لے جائیں گی۔

پنڈت جواہر لال نہرو امیر کارواں ہی نہیں تھے بلکہ قلوب اور ذہنوں پر بھی ان کی حکومت تھی۔ یہ ان کا اعجاز تھا کہ ہر طبقہ اور نقطۂ خیال کے لوگ انہیں اپنا ہی سمجھتے تھے۔ قائدین میں یہ وصف کم دیکھا گیا ہے، انہیں وطن سے پیار تھا۔ وطن کا ہر ذرّہ ان کا محبوب تھا، اسی لئے وہ اپنی عیش و آرام کی زندگی کو تج کر، عوام کی صف میں شامل ہو گئے۔ وہ ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور چاہتے تو اور افراد کی طرح عیش و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کا دِل وطن کی محبت سے لبریز تھا۔ انہوں

نے آرام کو اپنے آپ پر حرام کیا، مُلک کو بیرونی تسلط سے آزاد کرانے کے لئے تن، من، دھن سب کی بازی لگادی۔ قوم کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ اس کے معاوضے میں انہیں اہلِ وطن کی عزّت اور پیار ملا۔ اس پر وہ نازاں تھے، یہی ان کی سب سے بڑی دولت تھی۔

وطن کی آزادی کے بعد، اس کے استحکام اور اس کی ترقی میں انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کردیا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ وہ قوم کی خاطر امر شہید ہوگئے۔ "ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق۔" پنڈت جی اپنے عہد کی سب سے اچھی پیداوار تھے، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ خود ایک عہد کے معمار اور خالق تھے۔ آج کا ہندوستان پنڈت جی کی تخلیق، ان کا شہ کار ہے اور ان کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ ایسے حالات میں، جب کہ اطراف کے ملکوں میں جمہوریت کے ڈھانچے یکے بعد دیگرے ڈھائے جارہے تھے، بھارت جمہوری اصولوں پر قائم اور اٹل رہا۔ جس طرح اس مُلک کی آزادی نے مشرق کے بہت سے مُلکوں کو آزادی کی راہ بتائی۔ اسی طرح بھارت کے اس عظیم جمہوریہ نے بعض اور مُلکوں میں جمہوری نظام کو متزلزل ہونے سے بچایا۔ اس سوشلسٹ جمہوریہ پر پنڈت جی کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ اس کی جڑیں بھارت میں کتنی مضبوط ہیں، ان کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ملک کی تاریخ میں اتنے بڑے سانحہ کے بعد بھی، اس جمہوری نظام کے پائے استقامت میں کہیں لغزش نہیں

پیدا ہوئی۔ جس امن و سکون سے پنڈت جی کے جانشین کا انتخاب اور باتفاق آرا انتخاب ہوا، اسے جمہوریت کا ایک اعجاز سمجھنا چاہیئے۔ یہ ہمارے لئے بڑی دل بڑھانے والی بات ہے۔ اس عظیم کامیابی نے مستقبل کے بارے میں ہماری توقعات کو بڑی ڈھارس دے دی ہے۔

آزادی کے اس معمارِ اعظم اور غیر مذہبی جمہوریہ کے صورت گر نے آزادی کے ابتدائی ہیجان خیز برسوں میں بڑے عزم و دور بینی سے نظم و نسق کا انصرام کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ آزادی سے پہلے کا عہد مہاتما گاندھی کا عہد تھا اور بعد کا زمانہ پنڈت نہرو کا۔ آزادی سے پہلے کے اس ستیزہ کار بہادر نے آزادی کے بعد نظم و نسق کے لئے اپنے آپ کو جیسا عظیم الشان مدبّر، ماہر سیاست اور حکمراں ثابت کیا، وہ بھی ان کی ہمہ جہتی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ اس نو آزاد ملک کے غیر آزمودہ قائد نے اپنی فہم و فراست سے، دُنیا کے مدبّرین میں شاید سب سے اُونچا مقام حاصل کر لیا۔ مشرقی ملکوں کے لئے تو وہ آدرش تھا، مغرب کے اہلِ سیاست بھی بار بار اس کی رائے صائب کا لوہا ماننے پر مجبور ہو گئے۔

پنڈت نہرو میں جس طرح بھارت کی آزادی متشکل ہوئی تھی اور وہ اس کی علامت بن گئے تھے۔ بھارت کے مشترکہ کلچر کا [illegible] تھے۔ تہذیب و شائستگی ان کے گھر [illegible] علامت تھے لیکن خود اُن کی ذات اس معنی میں گھرانے کا فخر تھی۔ [illegible] کلاسیکی [illegible] تصنع کا پروردہ

نہ تھا بلکہ قوموں اور تہذیبوں کے بارے میں ان کی گہری واقفیت اور اپنے ملک کی تہذیبی صلاحیتوں کا پیدا کردہ تھا۔ تنگ دلی اور تنگ نظری کا شائبہ بھی کسی نے ان کے قول و فعل میں نہیں دیکھا۔ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے صاحبِ بصیرت تھے اور یہ جانتے تھے کہ دُنیا کے ترقی پذیر رُجحانات کس رُخ کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو اسی کے لئے تیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ غیر مذہبی سوشلسٹ جمہوریہ' بھارت کو ان کا بڑا قیمتی عطیہ ہے۔

انسانوں اور واقعات کے گہرے تجربوں نے پنڈت جی کے اس ایقان کو استحکام بخش دیا تھا کہ کوئی تہذیب خصوصی نہیں اور اس تیزی سے سمٹنے والی دُنیا میں شائستگی کی کسی چھاپ کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مخصوص ہے بلکہ وہ ترکیب یا SYNTHESIS کے قائل تھے اور اس جزو بندی کا بڑا نمونہ خُود ان کی زندگی تھی۔ جس کا اصول خذ ما صفا و دع ما کدر تھا۔ لسانی معاملات میں بھی وہ اسی "سنتھی سِس" کے قائل نظر آتے تھے۔ مُلک کی ساری اہم زبانوں کو انہوں نے قومی زبانوں کا مقام عطا کیا تھا، لیکن نیم پختہ وطن پرستی کا شکار ہو کر، کسی کام کی بدیسی زبان سے کنارہ کشی یا نفرت ان کو نہیں بھاتی تھی۔ ہم لوگ' جو خانوں میں بٹ کر رہنے کی طرف زیادہ مائل ہیں، کبھی کبھی ان کی فراست تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہم میں سے بعضوں کے ذہنوں میں

بغاوت انگڑائی لیتی، لیکن ان کی گہری معلومات اور آگہی، جس تحکم کے مقام سے بولتی تھی، اس کے رُوبرو ہماری ہیچمدانیاں سرنگوں ہونے پر مجبور تھیں۔

جواہر لال نہرو کی وسیع ہمدردیوں، دلچسپیوں اور خلوص نے ساری دُنیا کے اعتماد کا حامل انہیں بنا دیا تھا، اسی لیئے ساری ترقی پسند دُنیا سے ان کے رشتے گہرے ہوگئے تھے۔ وہ جتنے ہندوستانی تھے، اتنے ہی آفاقی بھی تھے۔ وہ ساری دُنیا کے باشندے تھے۔ تنگ نظرانہ قومیت، یا قومی تنگ نظری، ان کی شخصیت کو بین قومی حلقوں میں قابل قبول نہیں بنا سکتی تھی۔ لیکن یہ وسیع نظری ان کی تربیت اور بنیادی ایقانات کا نتیجہ تھی، کسی سستی مقبولیت کے احساس کی پیدا کردہ نہیں۔

یہ دراصل نہایت شائستہ انسان کے علائم ہیں۔ وہ انسان جس کی ذہنی زندگی خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ وہ اپنی قوم اور اپنی شائستگی سے محبت کرتے ہوئے بھی، ایک وسیع ترین قومی خاندان کا فرد ہوتا ہے۔ اور اس نقطۂ خیال کے عالمی فوائد اور ان کی ضرورت سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اسی وقت دُنیا کا ہر گوشہ اس کی طرف لبیک کہتا ہوا بڑھتا اور اسے اپنا سمجھتا ہے۔

بعینہٖ یہ حال پنڈت جی کا بھی تھا۔ وہ بلند، بہت بلند شخصیت کے مالک تھے بلکہ ایک آدرش انسان تھے۔ ان کی انسانیت اتنی ہمہ گیر اور ہزار شیوہ ہے کہ ہمارے خراج تحسین سے اس کا ایک

گوشہ بھی پُر نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ دُعا کر سکتے ہیں کہ ہم کو ان کی آگہی عطا ہو تاکہ ہم ان کے نقش قدم پر چل سکیں اور اپنے امیرِ کارواں کی وسیع اور بلند انسانیت کی روایت تقویم پارینہ نہ بن جائے!

اسی میں بھارت کی عظمت کے نشان مضمر ہیں۔

دردِ شیریں

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

ہمارے کسی پیارے عزیز کو، جس کی محبّت ہمارے دِل میں بس گئی ہو، روئیں روئیں میں سما گئی ہو، خون میں مِل کر رگوں میں گردش کر رہی، موت کا بے رحم ہاتھ ہم سے چھین لے تو ہم پر کیا گزرتی ہے۔ پہلے چند لمحوں میں تو ایسا لگتا ہے کہ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرا رہا ہے۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے ہیں۔ دِل بیٹھا جاتا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا، کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ اس کے بعد جب مدہوش شعور کو ہوش آنے لگتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے ؎

آہ سوزاں لب تک آئی اشک ناب آنے کو ہے
جوش میں گُل ہیں دُھواں اُٹھا گلاب آنے کو ہے

اس جوشِ گریہ کو روکنے کی کوشش میں ہم دانتوں کو بھینچتے

ہیں۔ ہونٹ چباتے ہیں، آنسوؤں کو کھلنے سے پہلے پی جاتے ہیں۔ مگر کب تک ؟ آخر ضبط کا بند ٹوٹ جاتا ہے۔ دِل کے ساتھ آنکھیں بھی قابو سے باہر ہو جاتی ہیں اور دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ کئی دِن تک یہ حالت رہتی ہے کہ جہاں مرنے والے کا ذکر آیا یا اس کی کوئی نشانی دکھائی دی اور آنسوؤں کا چشمہ اُبل پڑا، جیسے زخمِ دل سے فوارہ چھوٹ رہا ہو! مگر پروردگارِ عالم نہ جانے کس مصلحت سے یہ چاہتا ہے کہ غمِ فرقت کے مارے کسی نہ کسی طرح جیے جائیں۔ اور دُنیا کا کاروبار چلتا رہے۔ اس کے حکم سے دِل کا گھاؤ وقت کے مرہم سے بھرنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا انگور بندھ جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد زخم مِٹ جاتا ہے، بس ایک نشان رہ جاتا ہے، اور ہم میرؔ کی طرح دِل پر ہاتھ رکھ کر بڑی حسرت سے کہتے ہیں ؏

اب جس جگہ پہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

مگر کوئی کوئی غم ایسا بھی ہوتا ہے اور ہندوستان کی آنکھوں کے تارے جواہر لال کا غم ایسا ہی غم ہے کہ ہم اسے کسی طرح بھولنا نہیں چاہتے۔ دِل کے گھاؤ کو پھوٹنے سے نہ روک سکیں مگر سوکھنے نہیں دیتے۔ بار بار مرنے والے کو یاد کر کے زخم کے انگور کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ اس سے جو میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے اس کی کیفیت دِل ہی جانتا ہے، لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ آج اس وقت پھر جی چاہا کہ اس دردِ شیریں کی خاطر یادِ حبیب کے نشتر سے زخمِ دِل

کو چھیڑوں۔ اس خیال کے آتے ہی پچاس برس کے زمانے کے جب سے میں جواہر لال کو جانتا ہوں، نہ جانے کتنے منظر پُرانی یادوں کے قید خانے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے کہ باہر نکلیں کھُلی ہوا اور روشنی میں۔ آخر ان میں سے دو چار جو رہائی پر سب سے زیادہ مُصر تھے، حافظے کی کال کوٹھری سے شعور کی جلوہ گاہ میں آ ہی گئے۔

۱۹۱۹ء کے سیہ پوش سال کا ایک دن ہے۔ جلیاں والا باغ کے شہیدوں کا سوگ منانے کے لئے الٰہ آباد میں عام جلسہ ہو رہا ہے۔ ایک بوُڑھا بھاری بھرکم رعب دار، مگر اس کے ساتھ ساتھ من موہن دِل نواز صدارت کی کرُسی پر بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر خود شناسی اور خود داری کا وقار اور خود اعتمادی کا سکون و اطمینان ہے۔ جو ایک عمر کے تجربے سے سال ہا سال تک مشکلوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر فتح پانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ہونٹوں پر ایک دِل کش مگر اُداس مُسکراہٹ ہے۔ اس کے قریب ایک سُبک اندام خوبصورت خوش وضع نوجوان کھڑا تقریر کر رہا ہے جس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک بھی ہے، غم و غصّے کی دمک بھی اور جوش و اضطراب کی تڑپ بھی۔ وہ بوُڑھا ملک کا بہت بڑا قانون دان الٰہ آباد کا چوٹی کا وکیل موتی لال نہرو ہے اور نوجوان اس کا بیٹا تازہ ولایت بیرسٹر، نیشنل کانگرس کا سرگرم کارکنُ جواہر لال ہے جو باپ کو ارباب دولت و اقتدار کی بزمِ خاص سے کھینچ کر آزادی کے متوالے غریبوں کی مجلس عام میں لے آیا ہے۔ یہ تو یاد نہیں کہ جواہر لال نے اپنی تقریر میں کیا کہا مگر یہ اچھی

طرح یاد ہے کہ وہ دورانِ تقریر میں کبھی جوشِ غضب سے بپھر جاتا تھا اور کبھی دفورِ الم سے رونے لگتا تھا۔ جواہر لال کی شخصیت کی یہ پہلی جھلک دیکھ کر مجھے جو اس وقت الٰہ آباد کے میور سنٹرل کالج کا ایک طالب علم تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک تیز و تند چشمہ پہاڑ کی آغوش سے نکل کر چٹانوں سے ٹکراتا شور مچاتا بہتا چلا جاتا ہے۔ دوسرا منظر غالباً سنہ ۱۹۳۰ء کے آخر کا ہے۔ دہلی میں گاندھی جی اور لارڈ اِرون میں ہندوستان کے سیاسی مسئلے پر بات چیت ہو رہی ہے اور اس سمجھوتے کے بعد گاندھی اِرون معاہدے کے نام سے مشہور ہوا۔ ابتدائی مرحلے طے ہو چکے ہیں۔ آخری فیصلہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر گاندھی جی، جواہر لال اور کانگرس کے اور بڑے بڑے لیڈر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شام کے وقت کوٹھی کے وسیع احاطے میں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع گاندھی جی کے درشن اور پرارتھنا سبھا میں شریک ہونے کے لئے اکٹھا ہے۔ تھوڑی سی جگہ میں بہت سے آدمیوں کے ٹھس جانے سے گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ کانگرس کے والنٹیر نظم و ضبط قائم رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جو کچھ ضرورت سے زیادہ پُرجوش معلوم ہوتا ہے، لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیل رہا ہے۔ اتنے میں جواہر لال نہرو جو کوٹھی کی سیڑھیوں پر کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں، بپھرے ہوئے شیر کی طرح جھپٹتے ہیں اور اس والنٹیر کی گردن کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہیں۔ لوگ گھبرا کر چپ چاپ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے

ہیں اور کوٹھی کے اس حصے میں سنّاٹا ہو جاتا ہے۔ اب جواہر لال کی صورت اچھی طرح نظر آتی ہے۔ گورا چہرہ غصّے سے لال بھبھوکا، تیوری چڑھی ہوئی آنکھوں کے پپوٹے سُوجے ہوئے جیسے رات کو جاگے ہوں یا دیر تک روئے ہوں۔ سُنا ہے وہ اس سمجھوتے سے جو گاندھی جی کر رہے ہیں، بہت خفا ہیں مگر باپو کی مرضی سے مجبور ہیں۔ اپنے طیش پیہم کو دباتے دباتے طبیعت کو گھونٹتے گھونٹتے کبھی اس طرح اُبل پڑتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کی زندگی کا چشمہ ابھی تک ناہموار، پتھریلی، کٹھن راہوں سے گذر رہا ہے اور جب کوئی نازک موڑ آجاتا ہے تو اس کا زور و شور اور جوش و خروش اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

اب ۱۹۴۶ء کی گرمیوں کا ایک سین آتا ہے۔ تحریک آزادی نہ جانے کتنے کڑے مرحلوں سے گذرنے کے بعد منزل کے قریب آپہنچی ہے۔ دہلی میں قومی لیڈروں اور برطانوی حکومت کی گفت و شنید خدا خدا کر کے کامیاب ہوئی ہے اور اندر ہی اندر یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ عارضی قومی حکومت جواہر لال کی سرکردگی میں بنائی جائے اور برطانوی وائسرائے کی عام نگرانی میں مُلک کے انتظام کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ مگر ابھی تک عام لوگوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ آزادی کی برات کے دولہا جواہر لال نہرو مہینوں کی تگ و دو اور کش مکش سے تھک کر چند روز آرام کرنے کے لئے نینی تال آگئے ہیں۔ جہاں میں کچھ دن پہلے سے ٹھہرا ہوا ہوں۔ ایک روز سہ پہر کو کوئی پانچ بجے میں ان کی قیام گاہ پر اللہ سے

پل کر واپس جا رہا ہوں۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر نکلے ہیں۔ اور گھوڑے پر بیٹھ کر سیر کو جا رہے ہیں۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ پگڑی جمی ہوئی ہے۔ طبیعت خوش، چہرہ بشاش ہے۔ مگر آنکھوں سے تردّد اور تامّل، بے چینی اور بے اطمینانی ٹپک رہی ہے۔ اُن کی زندگی کی ندی اب مسطح زمین میں پہنچنے والی ہے۔ مگر چونکہ شروع سے اب تک سنگ لاخ پہاڑی راستوں کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کی عادی رہی ہے اس لئے میدان کی ہموار راہیں، جن پر اُسے اب چلنا ہوگا، اجنبی سی لگتی ہیں۔ اور وہ اسی سوچ وچار اور ادھیڑ پن میں ہے کہ نہ جانے اِن اَن دیکھے راستوں میں کیا رکاوٹیں پیش آئیں اور کیا اُفتاد پڑے!

اب ایک چوتھا منظر بھی دیکھ لیجیے۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں جاڑوں کی ایک شام ہے۔ نئی دہلی میں وگیان بھون کے ایک کمیٹی رُوم میں کسی طبّی سیمنار کا جلسہ ہے۔ سارے مُلک کے بڑے بڑے ڈاکٹر اور دوسرے معزّز مہمان جمع ہیں۔ سب کی آنکھیں داہنے ہاتھ کے دروازے پر لگی ہیں۔ آزاد جمہوریہ ہند کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سیمنار کے افتتاح کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ بالکل ٹھیک وقت پر، نہ ایک پل اِدھر، نہ ایک پل اُدھر، ایک ستر سال کا خوب رُو، طرحدار بُوڑھا بگلے کے پَر کی سی سفید کھدّر کی اچکن پہنے گاندھی ٹوپی اس انداز سے سر پر رکھے کہ سادگی میں کج کلاہی کی شان نظر آ رہی ہے، ایک سُرخ گلاب تر و تازہ شاداب سینے پر بائیں طرف لگائے دروازے میں داخل ہوا اور پھُرتی

اور مضبوطی سے قدم رکھتا حاضرین کے مجمع کو، جو تعظیم کے لئے سرو قد کھڑا تھا، ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا ہوا ڈائس کی سیڑھیوں چڑھتا ہے۔ اور معزز مہمان کی کرسی پر رونق افروز ہوتا ہے۔ اب اس کی صورت غور سے دیکھئے۔ فکر و تردّد کی سلوٹیں ماتھے پر اب بھی ہیں مگر چہرہ بالکل پُرسکون ہے۔ بے چینی یا بے اطمینانی، رُکاوٹ یا ہچکچاہٹ نام کو بھی نہیں۔ اس کی جگہ حکمت و تدبّر کے ٹھہراؤ، صبر و حِلم کی نرمی، عزم و حوصلے کی اُستواری نے لے لی ہے اور آنکھوں کا تو کچھ عجیب عالم ہے۔ ایک درد و محبّت کی کیفیت، جیسے ساری ہندوستانی قوم بلکہ پُوری انسانی برادری کے دُکھ ان آنکھوں میں سما گئے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک ربودگی کا انداز، جیسے یہ آج کی پُرآشوب دُنیا سے بے خبر اور بے پروا کل کی پُرامن اور پُرمسرّت دُنیا کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ وہ تقریر شروع کرتا ہے لیکن مدہم آواز۔ دھیمے بڑے پُرسکون لہجے میں سوچتے سمجھتے سمجھاتے ہوئے، جیسے کسی زمانے میں اس کے گورو گاندھی جی بولا کرتے تھے اور ان ہی کی طرح حاضرین کو یہ تلقین کرتا ہے کہ اپنے علم و فن کی برکتوں کو شہر دِلی تک محدود نہ رکھیں بلکہ دیہات کی جھونپڑیوں تک پہنچائیں اور ان غریب، بے کس بیماروں کی خدمت کریں جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ اور کوئی اُن کی نبض نہیں دیکھتا۔ اُن کو دوا نہیں دیتا۔ گاندھی جی کی آواز جواہر لال کے مُنہ سے نِکل کر سُننے والوں کے دِلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور شعور

کی سطح سے گذر کر لاشعور کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہیں۔

اُس وقت جواہر لال کی بحرِ حیات میں وہ وُسعت اور گہرائی، خاموشی، سکون و قرار نظر آرہا تھا جو دریا میں سمندر کے قریب پہنچ کر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کو ساڑھے تین ہی برس گذرے تھے کہ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو اس دریائے فیض و کرم کا آبِ حیات سرزمین ہند کو جیسا سوکہ سترہ سال کے عرصے میں ممکن تھا، سیراب و شاداب کر کے اس بحرِ سرمدی میں گرا اور کھو گیا۔ جس کا ایک سرا ازل ہے اور دوسرا ابد۔ جانے والا چلا گیا۔ ہماری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔ مگر سہ یاد اُس کی دردِ شیریں بن کے دل میں رہ گئی

جواہر لال نہرو

اور

کشمیر

نند لال واتل

جواہر لال کو کشمیر اور کشمیری عوام سے محبت تھی۔ بے شک اُن کی فکر کے دائرے میں سارا جہاں سمایا ہوا تھا۔ وہ قومی اور دینی تعصبات سے بالاتر اور انسانیت کے پجاری تھے لیکن کشمیر کے خلاف، شفاف پہاڑوں اور سیماب جو یباروں سے اُنہیں جو پیار تھا اُسے اُنہوں نے کبھی چھپایا نہیں۔ کشمیریوں کی سود و بہبود میں اُنہیں جو دلچسپی تھی اُس کے ایک نہیں، کئی ثبوت موجود ہیں۔ جنم تو اُنہوں نے وادیٔ گنگ و جمن کے شہر الہ آباد میں لیا لیکن یہ بات وہ کبھی نہیں بھولے کہ وہ اور اُن کے آباؤ اجداد کشمیری الاصل ہیں، اور کشمیر اُن کا وطن مالوف ہے۔

کشمیر کے عوام کو بھی جواہر لال سے بے پناہ پیار تھا، یہ جانتے ہوئے بھی، کہ جواہر لال حقیقی معنوں میں عالمی شہری ہیں۔ کشمیری لوگ اُنہیں اپنا سمجھتے تھے، خود کو اُن کے قریب تر محسوس کرتے تھے اور شاید اسی احساس کے تحت وہ جواہر لال پر اپنا حق بھی جتاتے تھے۔ اس بات کی کئی

شائع ہو چکی ہیں۔ جب اس پر دو اور جلدیں ہوئیں کشمیری اپنے مسئلے لے کر اُن کے پاس پہنچے اور مدد مانگی۔

ایک قومی رہنما کے طور پر جواہر لال پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء میں کشمیر آئے۔ اُس وقت تک لوگ اُن کے ایثار، اُن کی بے مثال جرأت اور جنگِ آزادی میں اُن کے کارناموں سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اس لیے جب وہ یہاں آئے تو کشمیری عوام نے اُن کا وہ استقبال کیا جو بے مثال تھا۔ جہاں بھی وہ گئے لوگوں نے اُن کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ کئی سو سال سے وہ دبے ہوئے تھے۔ شخصی حکمرانی کے ظلم و جبر کی وجہ سے اُن کی جو حالت ہو گئی تھی اس کا نقشہ علامہ اقبال نے اِن اشعار میں کھینچا ہے:

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ ۔۔۔ بُتے مے تراشد ز سنگِ مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او ۔۔۔ نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے ۔۔۔ نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے

جواہر لال کو اپنے درمیان دیکھ کر اُن کی خودداری اور قومی غیرت کا جذبہ بیدار ہوا۔ انہیں اس ماحول سے نفرت ہو گئی جو شخصی حکومت کا پیدا کردہ تھا اور جس میں انہیں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع میسر نہیں تھے۔

۱۹۴۴ء میں جواہر لال پھر کشمیر آئے۔ اُن ہی دنوں سوپور میں نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ جواہر لال نے اس اجلاس میں شرکت کی اور [illegible] تقریر کی اور اپنے مخصوص دلنشین پیرایے

میں لوگوں کو آزادی اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے اور اپنی قسمت کو بنانے کا درس دیا۔

۱۹۴۶ء میں جواہر لال پھر کشمیر آئے۔ یہ وہ دن تھے جب یہاں "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک چل رہی تھی جو "کوئیٹ کشمیر" QUIT KASHMIR کے نام سے مشہور ہے۔ جواہر لال نے اس تحریک کی حمایت کی اور اپنے بیانات سے سارے برصغیر میں رائے عامہ کو اس کے حق میں منظم کیا۔ جب اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو خود یہاں چلے آئے۔ کوہالہ کے پل پر ریاستی پولیس نے آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن جواہر لال ایک تیز و تند دریا کی طرح آگے بڑھے۔ پولیس اور فوج کی سنگینیں آپ کو روک نہ سکیں۔ ریاست کی حدود میں داخل ہو کر جواہر لال کو قید کیا گیا۔ سارے ملک میں ایک ہیجان بپا ہوا۔ پریشانی کی شدت میں اس وجہ سے اضافہ ہوا کہ برطانوی گورنمنٹ کا بھیجا ہوا کیبنٹ مشن ملک میں آیا ہوا تھا اور رہنمایانِ قوم مشن کے ارکان کے ساتھ ملک کی آئینی پوزیشن کے بارے میں اہم گفت و شنید کرنے میں مصروف تھے۔ مرحوم مولانا آزاد نے جو ان دنوں کانگریس کے صدر تھے، بڑی مشکل سے جواہر لال کو واپس آنے پر مائل کیا۔ لیکن اس وقت تک آپ کئی دن جیل میں گذار چکے تھے اور اپنے عمل سے ثابت کر چکے تھے کہ آپ کشمیری عوام کے ایسے دوست اور غمخوار ہیں جس پر وہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ تھوڑے وقت کے بعد ہی جواہر لال پھر کشمیر گئے۔ اس مرتبہ حکومت کے ارباب اختیار کی عقل ٹھکانے آچکی تھی اور آپ کے آنے

میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف مقدمۂ بغاوت کی سماعت جاری تھی اور جواہر لال بیرسٹر کا لباس پہن کر صفائی کے وکیل کے طور پر عدالت میں آئے۔ اس واقعہ کی یاد کشمیری عوام کے ذہنوں سے ابھی مٹ نہیں سکتی۔ جواہر لال کی کشمیر نوازی کا اس سے زیادہ مؤثر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

ملک کے آزاد ہونے کے ساتھ ہی کشمیر میں بھی جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ آخری سانس تک وہ کشمیر کے معاملوں میں گہری دلچسپی لیتے رہے اور ان کی اس دلچسپی کے نتیجہ میں ریاست نے مختلف شعبوں میں نمایاں ترقی کی اور کر رہی ہے۔

عام لوگوں کے ساتھ جواہر لال کے تعلقات کی بیسیوں کہانیاں مشہور ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں جب آپ یہاں آئے تو امیرا کدل میں ایک تھانیدار نے ایک نوجوان کو اس وجہ سے پیٹا کہ وہ "بیعنامہ امرت سر کو توڑ دو" اور "نیا کشمیر زندہ باد" کا نعرہ بلند کر رہا تھا۔ جواہر لال نے موٹر رکوائی اور دوڑتے ہوئے اس تھانیدار کے پاس گئے اور اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

ایک دفعہ سرینگر سے ہٹن جا رہے تھے کہ وہاں عورتوں کی ایک بڑی تعداد کو منتظر پایا۔ اس وقت زور کی بارش ہو رہی تھی اور موٹر سے باہر نکلنا کار سے دارد والا معاملہ تھا لیکن آپ موٹر سے باہر آئے اور ہنس ہنس کر ان عورتوں سے ملے۔ بارش سے بھیگتے رہے لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ آپ وہاں سے فوراً جانا چاہتے ہیں۔ اسی اثنا میں

ایک معمّر خاتون آگے بڑھی اور آپ کا ماتھا چوما۔ پہلگام سے آرُو جاتے ہوئے اچانک ایک، گوجر گھرانے میں داخل ہوئے۔ ایک خاتون مکی کی روٹیاں بنا رہی تھی۔ معزّز مہمان کو اپنے یہاں آتے دیکھ کر اُس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ ایک روٹی اور کچھ سالن پیش کیا۔ جواہر لال نے بلا جھجک اسے لیا اور مزے لے کر کھانے لگے۔ اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مجھے ایسا لگا کہ ایک بڑے گھرانے کی خاتون نے مجھے اپنے محل میں دعوت پر بُلایا ہے۔" دو سال کی بات ہے کہ پہلگام میں سیر کرتے ہوئے ایک گھوڑے والے کے متعلق دریافت کیا۔ مُشکل سے اس کا پتہ لگایا گیا۔ جب وہ آیا تو جواہر لال نے اُسے پہچانا اور کہا کہ وہ اُس کا گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کئی سال پہلے اس گھوڑے والے سے اُن کی جان پہچان ہو گئی تھی۔ دوسرے دِن وہ اس کے گھر گئے اور وہاں نمک والی چائے پی۔

سرینگر کے ایک باشندے کے لڑکے کو حکومت نے کسی تربیتی کالج میں داخلہ کے لیے نامزد نہیں کیا۔ یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب یہاں تربیتی کالج قائم نہیں کیے گئے تھے۔ اس نے جواہر لال کو چِٹھی لکھی جس میں شکایت کی گئی تھی کہ اُس کے لڑکے کو اس بات کے باوجود نامزد نہیں کیا گیا ہے کہ اس نے امتحان میں اچھا درجہ حاصل کیا تھا۔ اس شخص کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب کچھ وقت کے بعد اُسے ریاست کے چیف سیکرٹری کے ذریعہ اطلاع مِلی کہ جواہر لال نے اُس کے لڑکے کے لیے بمبئی

کے ایک تربیتی کالج میں داخلہ حاصل کیا ہے۔

ایک کشمیری طالب علم بیرون ریاست کے ایک تربیتی کالج میں ٹریننگ لے رہا تھا۔ بدقسمتی سے وہ امتحان میں فیل ہو گیا۔ قاعدہ کے مطابق اُسے دوسرے سال کے لئے ریاستی سرکار قرضہ نہیں دے سکتی تھی۔ یہ طالب علم اپنے والد کو اپنی مشکل سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تربیت کو مکمل کرنے کے لئے اُسے روپیہ کی ضرورت تھی۔ کرے تو کیا کرے، فوراً خیال آیا اور جواہر لال کو خط لکھا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس کشمیری طالب علم کو جواہر لال نے تین ہزار روپے کا چیک بھیجا ؟ اس طالب علم کا باپ سرکاری ملازم ہے۔ جب جواہر لال جی کے سرگباش ہونے کی خبر سُنی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ساتھیوں نے جب جذبات کے اس غیر معمولی اظہار پر پوچھ تاچھ کی تو یہ واقعہ بیان کیا۔

اس قسم کے کئی اور واقعات کے حوالے دئے جا سکتے ہیں جن سے واضح ہوگا کہ جواہر لال کو کشمیر اور کشمیری عوام سے گہری محبت تھی۔ اُن کے اس دُنیا سے اُٹھ جانے پر بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ امریکہ کے صدر جانسن نے کہا ــــ "جواہر لال انسانیت اور جنگ کے درمیان حائل تھے ــ" روس کے وزیر اعظم خروشچیف نے کہا ــــ "جواہر لال امن کے پرستار تھے ــ" متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر نے کہا ــــ "جواہر لال نورِ ایشیا تھے۔" ہندوستانی عوام رو رہے ہیں کہ جواہر لال اُن کا چہیتا رہبر تھا اور کشمیری عوام اپنے بہترین مونس

اور غم خوار کو رو رہے ہیں اور ساری کائنات میں علامہ اقبال کی یہ آواز گونج رہی ہے کہ ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم نازیک دانائے راز آید بروں

جواہر لال نہرو

سوویت یونین میں

ظ۔ انصاری

جواہر لال نہرو تین بار سوویت یونین گئے۔ ایک بار ۱۹۲۸ء سے پہلے جب وہ اپنی بیوی کملا نہرو کا علاج کرا کے انگلینڈ سے واپس آ رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روس صدیوں کے خواب سے چونک اٹھا تھا۔ ہر طرف ہما ہمی تھی۔ خانہ جنگی کا ملبہ پڑا تھا۔ نئی زندگی کی تعمیر کے نقشے تیار ہو رہے تھے۔ تاریخ عالم اور دنیا کی سیاسی منصوبہ بندی پر جو گہری عالمانہ نظر جواہر لال کی تھی۔ اسی کا تقاضا تھا کہ وہ روس کے اس عبوری دور کو اپنی آنکھوں دیکھ لیتے۔ دنیا کے بڑے بڑے دانشور جن سے جواہر لال کے تعلقات قائم ہوئے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز، جان اسٹریچی، ہارس ڈوب، برنارڈ شا، رومین رولاں سب اس ملک کو نگاہِ شوق سے دیکھ رہے تھے۔ جواہر لال نہرو پر اشتراکی

تعلیم کے اثرات جیسا کہ انہوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے پڑ چکے تھے۔ جواہر لال نے وہاں کے قیام میں جو دیکھا سُنا اور سمجھا وہ اس طرح دلنشین انداز میں لکھا ہے کہ آج بھی پورے سوویت یونین بلکہ باخبر دنیا میں توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ ان کی ذاتی شہرت کا پہلا نقش یہیں سے قایم ہوا۔

دوسری بار جون ۱۹۵۵ء میں جواہر لال روس گئے اور تمام ملک کا اسی طرح طوفانی دَورہ کیا جیسا وہ اپنے ملک کا تحریک آزادی کے زمانے میں یا الیکشن کے دنوں میں کیا کرتے تھے۔ روس کے نئے حالات اور نئے انتظام نے انہیں بڑے چاؤ سے بُلایا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ جس دھوم دھام سے نہرو کا استقبال وہاں ہوا ہے۔ وہ انقلاب ۱۷ء کے بعد کے ۴۰ سال میں کسی ایک شخص کو نصیب نہیں ہوا۔

مغرب کے ملکوں میں جواہر لال کو ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک پُر جوش رہنما ایک متفکر ڈپلومیٹ، صاحب قلم، مشرق کی تہذیب کا نمایندہ اور مغربی تعلیم کا دلدادہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر جگہ کے اہل علم اور اہل نظر اُن کی تحریروں اور تقریروں پر نگاہ رکھتے تھے۔ اُن سے ملنے کو قابل فخر سمجھتے تھے۔ لیکن روس میں تو جواہر لال اس کے علاوہ بہت کچھ تھے اور یہ بات جون ۵۵ء کے دورے میں کھل کر دنیا کے سامنے آگئی۔

تیسری بار ستمبر ۶۱ء میں جب پنڈت جی بلگراڈ کی غیر جانبدار

ملکوں کی کانفرنس سے واپس ہوئے تو پھر ماسکو آئے۔ جرنلسٹوں کی ایک پوری ٹیم اُن کے ساتھ تھی۔ بلگراڈ کانفرنس دراصل وزیراعظم نہرو۔ صدر ناصر اور صدر ٹیٹو نے بلائی تھی اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آج بھی نو آزاد ملکوں کی خارجہ پالیسی پر اس کانفرنس کے فیصلوں کا اثر موجود ہے۔ اس بار جواہر لال سوویت یونین کے خاموش دَورے پر آئے تھے۔ لیکن آٹھ دس میل تک راستے پر دونوں طرف ہزارہا آدمیوں کا ہجوم استقبال کے لئے موجود تھا۔ میں نے اس سفر میں اُن کو قریب سے دیکھا۔ اُن کی باتیں سُنیں اور مجھ پر یہ راز کھلا کہ سوویت یونین کا ایک ایک آدمی اُنہیں اس قدر کیوں چاہتا ہے۔

رُوسی زبان میں "ج" کی آواز نہیں ہے۔ "د" اور "ژ" کو ملا کر کسی قدر "ج" کی آواز پیدا کی جاتی ہے۔ میں ایسے سینکڑوں روسی مردوں اور عورتوں سے ملا ہوں۔ جنہوں نے جواہر لال نہرو کی آمد پر "ج" کا تلفظ کرنا سیکھا تھا۔ کس لئے؟ تاکہ اس عظیم ہمسایہ ملک کے محبوب مہمان کو خوش آمدید کہتے وقت اُس کا نام ٹھیک ٹھیک ادا کر سکیں۔

۱۹۵۶ء میں مجھے روس میں پہلی بار جانے کا اتفاق ہوا۔ اور جب کبھی میں اپنے ہندوستانی وضع کے کپڑے پہن کر سڑک پر نکل جاتا تھا تو سڑک پر میرے بجائے میرا جلوس نکلتا تھا اور ہر طرف سے

یہی آواز سُننے میں آتی تھی۔" یہ جواہر لال نہرو کے ملک سے آئے ہیں۔"

نہرو جس کے ہم بچپن سے گیت گاتے تھے۔ اس کے درشن کرنے کی آرزو میں ہمارے پاؤں مچلے جاتے تھے۔ روس میں اس کی عظمت اور مقبولیت کا احساس کر کے ہم ہندوستانیوں کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔ سوویت یونین کے شہروں میں، دیہات میں، بازاروں میں، یونیورسٹیوں میں، قفقاز کی پہاڑیوں پر، کریمیا کے ساحل پر، ازبکستان کی مسجدوں میں اور ترکمانستان کے ریگ زاروں میں جہاں مجھے بے تکلفانہ باتیں کرنے کا موقعہ ملا۔ جواہر لال کا نام آتے ہی تعریف اور تذکرے میں لوگ اس طرح ایک دوسرے سے سبقت کرنے لگتے تھے جیسے یہ اُن کا آپس کا معاملہ ہے اور بے خودی کے عالم میں بھی کبھی ایک لفظ برائی یا تنقید کا سُننے میں نہیں آیا۔ جواہر لال جس طرح عام آدمی سے محبت کرتے تھے۔ اس کی روزمرہ کی باتوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ سوویت یونین کے کروڑوں مرد و زن انہیں اسی طرح چاہتے تھے اور ان کی زندگی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھا کرتے تھے۔

سوویت یونین کے سفر کے بہت ایسے دلچسپ واقعات سُننے میں آئے جن سے جواہر لال نہرو کے بے تکلفانہ برتاؤ کا پتہ چلتا تھا۔ یورال پہاڑی سلسلے میں ہی دریائے یورال پر ایک لمبا

پل ہے، اس پل کا مشرقی سرا شہر کے کارخانوں اور فیکٹریوں کے مرکز کو لے جاتا ہے۔ اور مغربی سرا نئی خوش نما، پر رونق آبادی کی طرف۔ جواہر لال نہرو اس پُل پر کھڑے ہوئے تو بلگانن نے کہا۔ دیکھئے آپ مشرق و مغرب کے سنگم پر کھڑے ہیں۔ پُل کے مشرق میں ایشیا ہے۔ مغرب میں یورپ، جواہر لال بولے۔ اچھا تو آپ نے یہ جو مشرق کی طرف کارخانے بنائے ہیں اور مغرب کی طرف پارک اور بنگلے۔ کیا مطلب کہ ایشیا محنت مشقت کرے اور یورپ عیش اُڑائے۔

تاشقند میں لوگوں نے انہیں اپنی ازبکی ٹوپی نذر کی تو وہی سر پر منڈھ لی اور تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ازبکی لہجے میں بولے۔ سلام علیکم ۳ لاکھ کے مجمع نے بیک آواز جواب دیا۔ وعلیکم السلام۔ چند جملے بولنے کے بعد رکے تاکہ ترجمان مقامی زبان میں ترجمہ کرلے۔ مجمع نے شور مچایا۔ نہیں نہیں آپ بولے جائیے ہم آپ کی بات سمجھ رہے ہیں۔

جواہر لال ایشیائی علاقوں میں کئی دن تک گھومے مسجدوں اور مزاروں تک بھی گئے۔ پلاؤ اور قورمہ اور نان کباب کھاتے رہے یہ اکیلے V.I.P. تھے جن کے لئے یورپین کھانے کا انتظام نہیں کرنا پڑا اور جواہر لال کا ایک ایک لفظ ایک ایک ادا ایک ایک تبسم ریڈیو، اخباروں اور ٹیلی ویژن کے ذریعے سوویت

یونین کے گھر گھر میں پہنچا۔ بچوں، بوڑھوں کی یادوں میں محفوظ رہ گیا۔

جولائی۔ اگست ۱۹۶۳ء میں ہندوستان کی قومی نمائش ماسکو میں ہوئی۔ وزیر اعظم خروشچیوف اُس کے افتتاح کے لئے آئے تھے۔ صرف ۲۵، ۳۰ منٹ کا پروگرام تھا لیکن افتتاحی تقریب کے بعد وہ ایٹ ہوم میں شریک ہوئے اور وہاں ہندوستانیوں سے بات چیت کرنے میں کوئی دو گھنٹے گزر گئے۔

نہرو سے جو انہیں ذاتی محبت تھی اُس کا ایک اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ انٹرنیشنل مجمع میں جہاں کہیں ہندوستانی آدمی کو دیکھ پاتے ہیں، خود بڑھ کر "نمستے" کہتے ہیں اور ڈنڈوت کرتے ہیں۔

ماسکو کی نمائش میں چند روز بعد مسز اندرا گاندھی بھی پہنچیں۔ وزیر اعظم ان سے ملے۔ پارٹی اور حکومت، دونوں کی رہنمائی خروشچیوف کے ہاتھ میں ہے اور وہ بہت ہی مصروف رہتے ہیں لیکن اندرا گاندھی نے جب انہیں شام کے کھانے کی دعوت دی تو پروٹوکول کے سارے قاعدے قانون توڑ کر وہ راضی ہو گئے اور جواہر لال کی بیٹی کی مہمانی میں وہ کئی گھنٹے بیٹھے مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔

سارا سوویت یونین ان دونوں رہنماؤں کے اس دلی رشتے کو غور سے دیکھتا تھا اور یہ بھی ایک راز تھا جواہر لال نہرو

کی مقبولیت کا۔ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ خروشچیوف اور دوسرے سوویت رہنماؤں سے ہندوستانی وزیراعظم کے یہ تعلقات محض سیاسی یا رسمی نہیں ہیں، ان کی جڑیں ذہن و شعور کی سخت سطح سے گزر کر جذبات کی نرم اور سوندھی گہرائی میں اُتر گئی ہیں۔

سوویت یونین سے جو وفد بھی ہندوستان آتا رہا۔ اس کے ہر ایک ممبر کے دل میں دو آرزوئیں ضرور ہوتی تھیں۔ تاج محل دیکھ لیں جواہر لال سے مل لیں اور جس کی دونوں آرزوئیں پوری ہوگئیں وہ شاد کام و بامراد گیا اور وہاں ہفتوں تک قصّے سناتا رہا۔ روس میں میری ایک پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھی، جو پچھلے دنوں ماسکو سے ہندوستان آئی۔ جیسے تیسے جواہر لال تک پہنچی۔ جواہر لال اوروں سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے وہ بیٹھے بیٹھے روہانسی ہوگئی۔ اچانک نوجوانوں کی طرح جواہر لال اس کی طرف مڑے۔ "اے لڑکی تو کیا پڑھتی ہے؟"

تیسرے دن جب اس لڑکی نے جواہر لال کے اس بے تکلّف اندازِ بیان کا ذکر مجھ سے کیا تو اس کی صاف شفاف بڑی بڑی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو تیر رہے تھے۔ کہنے لگی "دیکھئے انصاری صاحب جواہر لال کیسے پیارے ہیں اوروں سے آپ جناب کر رہے تھے مجھ سے تُو تُو کر کے باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا ہمارے

اپنے رشتہ دار ہیں۔

سوویت یونین میں پندرہ قومیں بستی ہیں جنہیں قومیتیں کہا جاتا ہے۔ ان کی زبانیں بھی الگ الگ ہیں ان کے علاقے بھی اور ناک نقشے بھی۔ روسی زبان سب پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں۔ جواہر لال کی مقبولیت کا اندازہ کیجئے کہ جواہر لال کی کتابوں کے روسی ترجمے پر روس کی ان قومیتوں نے قناعت نہیں کی۔ مختلف اوقات میں اپنی مقامی زبانوں میں اُن کے ترجمے کئے۔ اقتباس چھاپے اور یہ چاہا کہ ہماری مادری زبان میں جواہر لال کا ترجمہ ضرور ہونا چاہیئے۔

نہرو جب سوویت یونین میں وسط ایشیا کا دورہ کر رہے تھے تو ترکمانستان کے پایۂ تخت عشق آباد میں بھی ان کے لئے ایک دن کا پروگرام رکھا گیا تھا۔

عشق آباد میں کئی اچھے ہوٹل ہیں پہلے ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا انتظام ہوا۔ بعد میں انتظامیہ محکمے نے طے کیا کہ جواہر لال نہرو کے قیام کے لئے خاص طور سے ایک آرام دہ بنگلہ بنا دیا جائے۔ شہر کی ایک شاہ راہ لینن پراسپکٹ پر یہ خوبصورت بنگلہ بن کر تیار ہو گیا۔ مگر جب نہرو عشق آباد کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ تو ان کے پاس شہر میں ٹھہرنے کا وقت نہیں رہا۔ ہوائی اڈے پر انھوں نے تقریر کی جو ساتھ ساتھ براڈکاسٹ ہو گئی

اور وہیں سے وہ لینن پراسپکٹ کے راستے آگے روانہ ہو گئے۔ وہ خوش نما بنگلہ صرف دور سے ان کے دیدار کر سکا۔ آج بھی اس پر کوئی تختی نہیں لگی ہے۔ کوئی نام نہیں لکھا ہے لیکن سارا شہر اس کو نہرو کا بنگلہ کہتا ہے۔ مسافروں کو لوگ راستہ اسی طرح بتاتے ہیں کہ لینن پراسپکٹ پر نہرو کا بنگلہ پوچھتے۔ چلے جاؤ۔

مجھے اچانک وہ عمر رسیدہ مہذب عورت یاد آگئی ہے جو فلسفے کی کتابیں سنبھالے ہوئے لینن گراڈ کی کسی نیم تاریک گلی سے گذر رہی تھی۔ ہم لوگ بھٹک گئے تھے۔ ہم نے اسے روک کر اپنے ہوٹل کا راستہ پوچھا۔ کچھ لہجے سے کچھ لباس دیکھ کر وہ ٹھٹکی آنکھوں پر چشمہ ٹھیک کیا غور سے دیکھا اور بولی تم جواہر لال کے دیس سے آئے ہو نا؟ ہم نے کہا ہاں"

اس نے ایک دم کتابوں کی ڈھیری وہیں رکھ دی۔ ہم کو بچوں کی طرح لپٹ کر پیار کرنے لگی۔ راستہ بتایا اور بولی "دیکھنا اگر یہاں ٹھہرو تو میرے گھر ضرور آنا وہ ہے سامنے میرا گھر۔ جواہر لال کا دیس ایک دن دنیا میں چمکے گا۔ مجھے تمہارے لیڈر سے پیار ہے۔ میری لائبریری میں ان کی تصویر لگی ہے وطن جاؤ تو جواہر لال سے میرا سلام کہنا۔ بھولنا نہیں۔ بچو"

سوویت یونین میں جواہر لال کی بے پناہ مقبولیت میں

کسی سیاسی مصلحت کو دخل نہ تھا، نہ سرکاری تعلقات کو، بلکہ اس کی جڑیں کافی گہری تھیں جنہیں پڑھے لکھوں کے قلم اور زبانِ خلق سے یوں سمجھا جا سکتا ہے :-

(۱) سوویت یونین میں تقریباً سو فی صدی تعلیم ہونے کی وجہ سے بیشتر لوگوں کو تاریخ اور ادبیات سے گہری دلچسپی ہے۔ تاریخ انھیں بتاتی ہے کہ دَورِ حاضر جو دو ہزار برس پہلے شروع ہوا، اُس کی جڑیں یونان، مصر اور ہندوستان کے تمدن میں پوشیدہ ہیں۔ اس طرح ہندوستان سے محبت کرنا اپنی تہذیب کی دو ہزار سالہ تاریخ سے رشتہ رکھنا ہے۔

(۲) ہندوستان نے روس کی طرح غریبی اور محکومی کی صدیاں گزاری ہیں اس کا احساس ہر ایک باشعور روسی، غیر روسی کے دل میں ہندوستان سے ہمدردی پیدا کرتا ہے۔

(۳) ہندوستان بھی روس کی طرح اپنے قدموں پر کھڑا ہونا، اور اپنی جنتا کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کو اُبھارنا چاہتا ہے۔ انقلاب روس کی پیداوار نئی نسل اس بات کو اپنی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری سمجھتی ہے۔

(۴) ہندوستان جو افسانوں، جوگیوں اور سانپوں کا ملک بنا کر بعض مغربی ادیبوں نے پیش کیا تھا اس کے افسانے جوگی اور سانپ بھی ایک طلسمی کشش رکھتے ہیں۔

(۵) ہندوستان کے خاص کر کشمیر کے کاریگر نے اپنی بے مثل ہنرمندی سے جو دنیا کے عجائب خانے اور آرٹ گھر سجا رکھے ہیں۔ اُن کی تصویریں دیکھ دیکھ کر اس قوم "چرب دست و تر دماغ" سے ایک محبت عام روسی کے دل میں خود بخود پیدا ہوتی ہے۔

(۶) فلسفے کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی جب تک ہندوستان کا فلسفہ اس میں شامل نہ کیا جائے اور حیرت انگیز بات یہ ہے۔ کہ نہایت مذہبی مشرق کے اس فلسفے میں مادیت کا تصور ہمیشہ قائم رہا ہے۔ یہ صفت پڑھے لکھے روسیوں کا دامن دل کھینچتی ہے۔

(۷) جواہر لال کی تقریروں اور تحریروں کے جو حصے روس میں شائع ہوئے۔ انہوں نے ایک ایسے لیڈر کی تصویر اُبھاری جو مختلف سماجی نظام میں رہ کر اپنے ملک کی مکمل آزادی اور پُر امن سوشلزم کا نقیب ہے۔

(۸) گاندھی جی کو، راجگوپال آچاری کو، مولانا آزاد کو روس نے نہیں دیکھا۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ روس نے جواہر لال کی شیروانی اور چست چوڑی دار پاجامے میں ہندوستان کی صدسالہ جنگ آزادی کو رواں دواں، خوش و خرم، بے تکلف، متفکر اور مذبذب دیکھ لیا۔ وہ ایک بار روس کو دیکھنے گئے تھے ۱۹۲۸ء سے پہلے دو بار روس نے

انہیں دیکھنے بُلایا۔ ۵۵ء اور ۶۱ء میں جواہر لال نہرو روسیوں کے لئے تاج محل کا حُسن بھی تھے۔ محنت کشوں کا دُکھ بھی، گاندھی جی کی سادگی بھی، ویدانت کا فلسفہ بھی، سوشلزم کا، دلِ زندہ بھی ــــــ افسانوں اور شوخیوں کی رنگا رنگ شخصیت بھی۔

(۹) ہندوستان نے بین الاقوامی سیاست میں جو غیر جانب داری اور امن پسندی کا ثبوت دیا۔ ملکی خون ریزیوں کو رکوانے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس کا بھی بڑا حصہ تھا۔ جواہر لال کی مقبولیت میں ؛

جواہرلال نہرو
کی فکر پر
مغربی اثرات

رام رتن پرہار

اس حقیقت کو اب پہلے کی نسبت زیادہ اور غالباً بجا طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے کہ سیاسی خیالات کسی سماجی خلا میں ارتقا پذیر نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ انسانی تواریخ کے کسی دَور میں موجود معاشرتی اور اقتصادی ماحول کی دھرتی میں وہ نشو و نُما پاتے اور پھلتے پھُولتے رہتے ہیں۔ دراصل کوئی بھی سیاسی مُفکر، چاہے وہ کچھ مادّی اور عملی نظریوں کا علم بردار ہو یا فضا کی بلندیوں میں نا خدائی کرنے والا آدرش وادی، اپنے ہم عصر ماحول سے مکمل طور پر کبھی بھی الگ اور اُوپر نہیں جا سکتا۔ مثلاً اس بات سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ مشہور یُونانی فلسفی افلاطون کی شہرہ آفاق تصنیف "ریاست" باوجود اپنے رس بھرے آدرش واد کے افلاطون کے ایتھنز کا ایک ادبی، دلچسپ اور

عالمانہ تجزیہ ہے۔ ایک مسلسل اور دائمی سیاسی جدوجہد اور توڑپھوڑ
کے طوفانوں میں گردن تک ڈوبے ہوئے ایتھنز کی رشوت خور اور گندی
رگوں میں، "ریاست" ایک نشتر ہے۔ صرف یہی نہیں، یہ اپنے اندر
ایتھنز کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی خرابیوں کے لئے ایک مؤثر علاج
لئے ہوئے ہے۔ یورپین سیاسی فلسفہ کے آسمان کے چند انتہائی
درخشاں ستاروں — ارسطو، سِسرو، آگاسٹائن، میکاولی، ہابز
روسیو اور ہیگل کے سیاسی فلسفے اپنے اپنے وقت کے بڑے مسائل کے
ردِ عمل اور آئینہ دار بھی تو ہیں۔ بالکل اسی طرح جواہر لال نہرو کے
سیاسی خیالات اپنے دَور کے اثرات سے مستثنےٰ قرار نہیں دئے جاسکتے
اور پھر اُن کی حالت میں ایک مزید اور غور طلب بات یہ بھی ہے کہ
اُن کے بہرصورت وسیع اور گہرے، مشترک و مُرکب اور انتہائی زُود
حِس من پر ایک پیچیدہ اور عالم گیر ماحول اثر انداز دکھائی دیتا ہے۔
ایک ایسا ماحول، جو دورِ حاضر کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیداوار
ہے اور جو جواہر لال نہرو کے نازک اور ہر لمحہ بیدار رہنے والے من پر
اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ اُن کے اپنے شہر الہ آباد کے نزدیک گنگا و
جمنا کے دھارے جس طرح ایک دوسرے میں گھُل مِل جاتے ہیں،
ٹھیک کچھ اسی طرح اُن کے سمندر کی طرح گہرے من میں مشرق و
مغرب کی گہری و چار دھارائیں ساتھ ساتھ بہتی دِکھائی دیتی ہیں۔

ایک جگہ اپنی "سوانح عمری" میں جدّت بھرے انداز میں وہ خوُد یوُں رقم طراز ہیں :

"میں مشرق و مغرب کا ایک عجیب مُرکب بن گیا ہوں۔ ہر جگہ میں ایک اجنبی کی طرح کھویا کھویا سا رہتا ہوں اور کہیں بھی اپنے آپ کو ایک مانوس و موزوں ماحول میں نہیں پاتا۔ شاید میرے خیالات اور نظریے مشرق کی نسبت مغرب سے زیادہ منسلک ہیں لیکن مادرِ ہند کئی طریقوں سے اپنے باقی بچوں کی طرح مجھُے بھی اپنی مادرانہ گرفت میں رکھتی رہی ہے اور میرے پیچھے من کی بہت گہری تہوں میں براہمنوں کی سینکڑوں پُشتوں سے وابستہ نسلی یادوں کے انبار پڑے ہوئے ہیں۔ میں نہ تو ماضی کے ورثہ سے سُبکدوش ہو سکتا ہوں اور نہ دورِ حاضر کی وراثت کو ترک کر سکتا ہوں۔ میں مغرب میں ایک اجنبی اور بدیشی تو ہوں ہی۔ میں مغرب کا کیسے ہو سکتا ہوں۔ لیکن اپنے دیش میں بھی کئی بار اپنے آپ کو ایک اجنبی سا محسوس کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر مُلک راج آنند "نہرو کا ایک مطالعہ" میں نہرو سے متعلق ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ نہرو کے مزاج، کیریکٹر اور ذہنی بلندی کے بہت سے تانے بانے ہند اور یورپ سے لئے گئے ہیں جس سے اُن کی شخصیت ایک بیش قیمت، خوبصورت اور کلا سے بھرپُور کشیدہ کاری کئے ہوئے کپڑے

کی مانند بن گئی ہے۔ یہ شخصیت کھادی کا گھریلو کاتا اور بُنا ہوا سادہ کپڑا نہیں جیسا کہ اُن کے بہت سے سادہ لوح سائقی سمجھتے رہے ہیں۔ "استعارہ کو جاری رکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "نہرو بذاتِ خُود اُس آرائشِ محفل کے بُننے والے ہی نہیں بلکہ اُن کی اندرونی دُنیا میں یہ رنگا رنگ تلنے بانے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوتے ہیں۔ لیکن دیکھنے والے سوائے شخصیت کی تعریف کرنے کے اور کر ہی کیا سکتے ہیں جب کہ اُس اندرونی نفسیاتی عمل کو، جس سے نہرو کی شخصیت معرضِ وجود میں آئی ہے وہ کبھی بہ چشمِ خُود دیکھ نہیں سکتے۔"

نہرو کے سیاسی خیالات پر مغربی اثرات سے متعلق کسی بھی مطالعہ میں "ہے رو" اور کیمبرج " کی درس گاہوں کو ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اُن کے سوچنے کے انداز اور فِکر میں ان درس گاہوں کا کیا اور کِتنا حصہ ہے اور ان کے فلسفۂ حیات کی تعمیر میں اُن کا کِتنا ہاتھ رہا ہے؟ بہر کیف نہرو بذاتِ خود اشتراکیت میں دلچسپی کے آغاز کو اپنے کیمبرج وغیرہ کے زمانے سے جوڑتے ہیں۔ اشتراکیت کے ابتدائی سبق انہوں نے کیمبرج یا "ہے رو" میں نہیں لئے اور نہ ایسے سبق اُن جگہوں پر کبھی دئے جاتے رہے ہیں۔ ہاں اس تعلیمی دَور میں انہیں جارج برنارڈ شا، سڈنی اور بی ٹرائس ویبرکے فے بیئن قسم کے سوشلزم نے اپنی جانب کھینچا۔ لیکن جیسا کہ وہ خُود واضح

کرتے ہیں اُس وقت سوشلزم میں اُن کی دلچسپی ایک خیالی اور تعلیمی نوعیت کی بات تھی۔ اپنی کوشش کے باوجود سوشلزم اور سائنس کے خیالات اُن کے لئے دُھندلے تھے۔ لیکن دُھندلے ہوتے ہوئے بھی وہ انسانی ہمدردی سے بھرپور تھے اور اُن میں سائنٹفک طریق کو شاید ہی کچھ دخل حاصل تھا۔

ہیرو میں نہرو ۱۹۰۵ء کے کرسمس سے ۱۹۰۷ء کے گرما کی تعطیلات تک لگ بھگ دو برس رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کیمسٹری، جیالوجی اور علمِ نباتات میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس دَور نے انہیں جارج برنارڈ شا کی دلچسپ تصنیفوں "تمہیدیں" اور میجر باربرا، ایچ، جی ویلز کی ایک جدید تصوّراتی نظام، لوئی ڈکنسن، میری ڈیبتھ کی تصانیف اور ٹاؤن سینڈ کی کتاب ایشیا اور یورپ سے رُوشناس کرایا۔ خصوصاً آخرالذکر تین کتابوں نے انہیں کافی متاثر کیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اُس کے بعد اُن کے محبوب مُصنّف برٹرینڈ رسل تھے۔ مجموعی طور پر اسی دَور میں نہرو نے خاص طور پر جو باتیں اپنے اندر جذب کیں اُن میں قابلِ ذکر تھیں: ایک سائنٹفک نقطۂ نظر، ایک سیدھا، صاف انگریزی اندازِ بیان۔ مختصر یہ کہ یہ سائنٹفک طریقِ کار ہی نہرو کے تمام خیالات اور عمل کی

بُنیاد رہا ہے اور اُن اصولوں اور قدروں کی، جن کے حصول کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

اُن کے سائنٹفک طریقِ کار کا ایک اور پہلو خُدا کے وجود سے متعلق غیر یقینی نظریہ تھا۔ جسے برٹ رینڈ رسل کی تصانیف کے مطالعہ سے تقویت ملی ہوگی۔ اس ضمن میں نہرو کا نظریہ مادّیت پر مبنی تھا۔ ۱۹۴۰ء کے انفرادی ستیہ آگرہ کے دوران وہ مہاتما گاندھی سے ملنے سیوا گرام واردھا گئے۔ اُس وقت یہ سمجھا جا رہا تھا کہ انگریزی سرکار نہرو کو کسی وقت بھی گرفتار کرے گی۔ اُسی موقعہ پر گاندھی جی سے الوداع ہوتے وقت کستوربا گاندھی نے حسبِ روایت آشیرواد دیتے ہوئے یہ دُعا کی تھی کہ خُدا نہرو کی حفاظت کرے۔ اس پر نہرو نے مُسکراتے ہوئے کستوربا سے پُوچھا تھا — "خُدا کہاں ہے؟ اگر وہ موجود ہے تو یقیناً گہری نیند سو رہا ہے۔"

قطع نظر اس کے کہ نہرو کی مادّیت میں میراث کا کتنا جز ہے۔ یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ لازمی طور پر یہ مادّیت اُن کے مغربی سائنس کے مطالعہ کا اثر تھی۔ نہرو فلسفیانہ پیچیدگیوں پر کبھی یقین نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی خُدا کی ذات کا کسی جسمانی قالب میں تصوّر کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ ایک ذاتی خُدا کے تصوّر کو عجیب و غریب شے سمجھتے تھے۔ میکل بریکر کی رائے کے مطابق وہ بعد میں ویدانت

کے فلسفہ سے متاثر ہوئے۔ لیکن یہاں بھی وہ مذہبی عقیدوں اور خالص فلسفیانہ پہلوؤں کو کوئی خاص اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ نہرو لکھتے ہیں۔ " غور و خوض کرنے والے اچھے لوگوں کے ذریعہ مذہب کی جیسے میں نے پیروی ہوتے دیکھی اُس سے مجھے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہوئی، چاہے یہ ہندو مت ہو، اسلام ہو یا عیسائیت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اوہام، روایات اور عقیدوں سے وابستہ ہے اور اس کے پیچھے ایک ایسا طریقِ کار کام کر رہا ہے جس کا سائنس سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے ... ہاں اس سے کسی کو انکار بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ مذہب نے انسانی فطرت کی ایک بڑی گہری خواہش کو پورا کرنے میں سعی کی ہے۔"

"ہیرو" اور "کیمبرج" کی تعلیم کا ایک حصہ نہرو کا زندگی سے والہانہ پیار اور اس سے پوری طرح لُطف اندوز ہونے کا نظریہ ہے کسی حد تک یہ جوانی کا مظہر ہے اور کسی حد تک آسکر وائیلڈ اور والٹر پیٹر کے پڑھنے کا اثر۔ وہ لکھتے ہیں۔ " زندگی میں آرام اور آنند اُٹھانے کی خواہش اور طریقِ کار کو ایک لمبا یُونانی نام دینا آسان بھی ہے اور پرُ لُطف بھی ... میں نے زندگی کا آنند لیا ہے اور میں اسے گناہ تصوّر نہیں کرتا۔" اُنھیں انسانیت کے تقاضے اور دوسروں کا بھلا کرنا بڑے مرغوبِ خاطر ہیں۔ کسی حد تک ڈاکٹر

فاسٹ کے مغربی آدمی کے تصور کے مطابق نہرو پورے طور پر زندگی سے لطف اندوز ہونے کے حق میں ضرور ہیں۔ لیکن اُن کی حالت میں خاص بات یہ ہے کہ وہ محض امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ، عیش و عشرت اور حیوانی سطح پر کھانے پینے سے ہی لطف اندوز ہونا مناسب نہیں سمجھتے اور انہیں ان سے اجتناب رہا ہے۔ اُدھر دوسری جانب وہ ویدانت اور بدھ مت کے اس نظریے سے بھی گریز کرتے ہیں جس کے مطابق انسان کو اپنے نفس پر قابو پانے کی غرض سے اپنے جسم کو اذیّتوں کے شکنجہ میں سے گذارنا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بدھ مت کی اخلاقیات سے متعلق قدروں سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

نہرو کے سیاسی خیالات میں مغرب کے سیاسی فلسفہ کی دو بڑی تحریکوں —— انگریزی سوشلزم اور مارکس ازم کا بڑا گہرا حصہ ہے۔ یہ دونوں نہرو کی وفاداری حاصل کرنے کے لئے باہمی کشمکش میں گرفتار دکھائی دیتی ہیں۔ انگریزی سوشلزم کی تشدد والے طریقِ کار سے نفرت اس کا نئے سماجی اور اقتصادی نظام کے لئے جمہوری اور پُرامن طریقِ کار کو دائمی طور پر اپنانا اور تدریجی ترقی کا اصول نہرو کو خصوصاً بڑی پُرزور اپیل کرتے رہے ہیں۔ ان سے متعلق جمہوری قدریں اور انسانیت اور شخصی آزادی کے لئے محبت نہرو کے من کو ہمیشہ کے لئے جیت چکی تھیں۔ لیکن دوسری جانب وہ مارکس کے خیالات سے

بھی کھینچے جاتے رہے ہیں۔ درحقیقت یہ دونوں وچار دھارائیں انہیں اپنی جانب کھینچتی رہی ہیں۔ مارکس ازم میں انہیں تشدّد بھرا طریقِ کار منظور نہیں، لیکن اس کی تواریخ کی اقتصادی تعبیر سے وہ بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ "قطع نظر روس کے مارکس ازم کے فلسفہ نے میرے من کے کئی اندھیرے حصوں کو روشنی دی ہے اور اب تواریخ میرے لئے نئے مطلب لئے ہوئے ہے۔ مارکس ازم پر مبنی تواریخ کی تعبیر مجھے خصوصاً بہت بھائی ہے۔"

اس کے دس سال بعد "دریافتِ ہند" میں وہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں رقم طراز ہیں — "مارکس اور لینن کے مطالعہ نے میرے من پہ بڑا گہرا اثر کیا ہے اور مجھے تواریخ اور موجودہ امورِ عالم کو دیکھنے کے لئے ایک نئی روشنی دے کر میری مدد کی ہے۔ مارکس کے فلسفہ میں مجھے بہت کچھ قبول ہے۔ مثلاً من اور مادہ کی وحدت، اصولِ تضاد، مادیت پر مبنی انسانی تہذیب و تمدّن کا بڑھتا ہوا قدم۔ ہاں! ان سے مکمل طور پر میری تشفی نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ میرے تمام سوالات کو تسلّی بخش طریقہ سے حل نہیں کر پاتے۔ اور پھر میرے من میں کبھی ایک دُھندلا آدرش وادی طریقِ کار، جو ویدانت سے کچھ ملتا جلتا ہے، جاگزین ہوتا رہا ہے۔" اس کے باوجود انسانی تہذیب و تواریخ کے ارتقا میں مارکس کا طریقِ کار، نہرو کی اپنی

سوانح عمری اور "تواریخِ عالم کی جھلکیوں" کے چند اوراق اور بابوں کے ڈھانچے کو بنائے ہوئے ہے۔ خصوصاً اُن مرحلوں پر، جن کا موضوع کسان اور اقتصادیاتِ ہند ہیں۔ "دریافتِ ہند" میں جو باقی کتابوں کی نسبت کافی بعد کی تصنیف ہے۔ مارکس کا اثر اتنا گہرا نہیں ہے اور مُصنّف کا من گہرائی، اخلاقیات اور رُوحانیت کی طرف زیادہ جُھکتا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال کارل مارکس کے "نیویارک ہیرلڈ" میں ہند کے بارے میں چھپے خطوط اور جواہر لال نہرو کی ہند کی اقتصادی تصاویر میں کافی مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر ملک راج آنند کا تو یہ کہنا ہے کہ موخر الذکر تصاویر مارکس کے بنائے ہوئے خاکوں کی نہایت مُناسب تکمیل ہیں۔ اس مشابہت کو سمجھنا ذرا بھی مُشکل نہیں رہ جاتا جب اس بات کو مدِّ نظر رکھا جائے کہ نہرو مارکس ازم کے فلسفہ کے کچھ اہم حصوں کو اپنا چکے ہیں اور اس نقطۂ نگاہ سے انھوں نے اٹلی کی فسطائیت، جرمنی کے نازی ازم، سنہ ۱۹۳۰ء کے عالمی اقتصادی بُحران، مانچوریا اور ابی سینا میں فسطائیت کی یلغار، سپین کی خانہ جنگی اور آسٹریا اور چیکوسلاواکیہ کی قومی آزادی کا جرمن نازیوں کے ہاتھوں گلا گھونٹنے کا بڑے پُرکشش طریقے سے تجزیہ کیا ہے۔ اس ضمن میں مارکس ازم کا فلسفہ اُن کے لئے قطبی ستارہ کا کام دیتا رہا ہے۔

عالمی اقتصادی بحران پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ خود بھی لکھتے ہیں
"یہ بڑا عالمی اقتصادی بحران مارکس وادی تجزیہ کو حق بجانب قرار
دیتا معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ باقی سب طریقِ تعبیر اندھیرے میں
بھٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ مارکس وادی تجزیہ ہی اس معاملہ کی صحیح
تشخیص کر رہا تھا اور اس کے لئے علاج تجویز کر سکتا تھا۔" یورپ
کے دو بڑے اثرات میں سے نہرو کی وفاداری جمہوری طرز کے سوشلزم
سے زیادہ ہے۔ اور اُن کی نکتہ چینی سے بالاتر ہے۔ وہ اس کے
اغراض و مقاصد اور طریقِ کار کو تہہ دِل سے منظور کرتے ہیں۔ برعکس
اس کے اُن کا مارکس ازم سے متعلق رویّہ مشروط ہے۔ وہ اس کے
آخری اور اہم مقصد یعنی غیر طبقاتی سماج کے قیام کو گرم جوشی سے
اپناتے ہیں۔ لیکن اس کے تشدّد والے طریق کار کو وُہ دُور سے بھی
چھُونے کے لئے تیار نہیں۔ اُنہوں نے جمہوری سوشلزم کو چُن
لیا ہے۔ ہاں جہاں تک فسطائیت اور کمیونزم کا تعلق ہے وہ
موخرالذکر کو اوّل الذکر پر ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں
"فسطائیت اور کمیونزم میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو میری ہمدردی
کمیونزم کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ یہ صفحات دِکھائیں گے، میں کمیونسٹ
ہونے سے بہت دُور ہوں۔ شاید میری جڑیں اُنیسویں صدی میں ہیں
اور میں جمہور و انسانیت کی قدروں سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ میرے

لئے اس سے مکمل طور پر باہر نکلنا مشکل ہے۔ میں کسی قسم کے عقیدوں کو پسند نہیں کرتا اور کارل مارکس کی تصانیف کو مذہبی کتابوں کی طرح ناقابلِ نکتہ چینی سمجھنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اور زیادہ کمیونسٹ فلسفہ کی طرف جھکتا جا رہا ہوں۔"

نہرو کی پارلیمنٹ اور اس سے باہر کی گئی گذشتہ پندرہ برس کی تقاریر کے مطالعہ سے اس بات کو تسلیم کرنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد وہ سوشلزم سے دُور ہٹتے گئے۔ صرف چند سال پہلے اُنھوں نے یوں لکھا تھا:۔

"میں سوشلزم پر بڑھتا ہوا یقین رکھتا ہوں۔ کمیونزم کے کچھ پہلوؤں پر بھی اور زیادہ اعتبار کرتا ہوں۔ اس کی خیالی باتوں پر اور مستقبل میں ایک کمیونسٹ سماج کے قیام پر۔ لیکن میں ہمیشہ اس شرط کو پیش کرتا ہوں کہ طریقِ کار پُرامن اور عدم تشدد پر مبنی ہونا چاہیئے۔"

یہ اُن کی پہل کا ہی نتیجہ تھا کہ کانگرس نے سوشلسٹ طرز کے سماج کے قیام کا اصول اپنایا۔ اُودی میں منعقد کئے گئے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سمینار میں اس کی مزید وضاحت بھی اُن کی خواہش اور منظوری کے مطابق ہوئی۔ سو نہرو کے نکتہ چینوں سے اس بات پر

اتفاق رائے نہیں کیا جاسکتا کہ جُوں جُوں اُن کی سیاسی طاقت اور شہرت بام عروج پر پہنچی؛ وہ سوشلزم سے دُور ہوتے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اصول نہرو کے من میں نہایت مضبوطی کے ساتھ آخر وقت جاگزیں رہے۔

نہرو کے سیاسی خیالات کے مغربی تانے بانوں میں ایک اور فلسفہ قوم پرستی کا ہے۔ اُن کو اس سے بے پناہ محبّت رہی ہے اور اس کے لئے اُن کی وفاداری لازوال ہے۔ اُن کی پبلک زندگی کے پچاس سال ایشیا اور افریقہ کی تواریخ کے اہم سال شمار کئے جا سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف ہندوستانی قوم پرستی ہی کے ایک بلند پایہ معمار ہیں بلکہ اُنہیں ایشیا اور افریقہ کی قومی بیداری کا ایک بڑا علمبردار اور پیامبر کہا جاسکتا ہے۔ وہ اٹلی کے قومی جنم داتا میزینی اور گیری بالڈی کی قومی مقاصد کے لئے کی گئی مہموں سے، آئرلینڈ میں قومی آزادی کے لئے کی گئی جد و جہد سے اور مصطفےٰ کمال پاشا سے جنہوں نے ترکی میں ایک آزاد ترکی کی بُنیاد رکھی، نہایت متاثر ہوئے ہیں۔ ان قومی کامیابیوں اور کاوشوں کا نہرو کے من پر بہت گہرا اور پائدار اثر ہوا ہے۔

نیشنلزم، جو اُنیسویں صدی کی نہایت طاقت ور قوّت رہی ہے، نہرو کی قوم پرستی کے ارتقا میں غیر مُلکی حکومت کے خلاف ایک

ردِ عمل کی طرح شامل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یورپ میں قوم پرستی نے اپنے لمبے ارتقا کے دوران آخرکار دو صورتیں اختیار کی ہیں۔ پہلی وہ قوم پرستی، جو انفرادی آزادی، بہبودی اور انسانیت کی قدروں سے دائمی طور پر وابستہ ہے اور دوسری وہ، جس نے فسطائیت کی نشو ونما کی۔ ظاہر ہے کہ نہرو کے ہاں اس دوسری قسم کی قوم پرستی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جمہوریت، انفرادی آزادی، معاشرتی بہبودی پر مبنی قوم پرستی کے بچاؤ اور پھیلاؤ کے لئے نہرو نے مذہبی جنون اور اس پر رکھی جانے والی نام نہاد قوم پرستی کو کامیابی سے دبانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ دباؤ تشدّد کا نہیں بلکہ دلیل اور خیالات کا دباؤ ہے۔ اُنہوں نے مذہب پرستوں کے اس مُلک میں مذاہب سے بالاتر ہو کر ایک ہندوستانی قوم پرستی کے پودے کو سینچا ہے جو اب ایک کافی مضبوط اور تناور درخت بن گیا ہے جسے مذہبی جنون اور اس بنا پر کئے جانے والے فسادات کے جھونکے اور طوفان کسی حالت میں تہ و بالا نہیں کر سکتے۔ مذاہب، ذات پات، نسلی امتیاز کے روائتی خیالات کے اس بڑے مُلک میں نہرو نے قومی یک جہتی اور وحدت کا واحد حل مذہبی رواداری پر مبنی آئین اور اُس کے مطابق کی جانے والی حکومت میں ڈھونڈا ہے۔ نہرو کا فلسفۂ قوم پرستی محض جذباتی نہیں رہا ہے۔ اُس میں نسلی تکبّر اور مذہبی جذبات کو

ذرہ بھر بھی دخل نہیں ہے۔ اُن کی قوم پرستی مذہبی رواداری اور شہریوں کی مساوات کی مستحکم چٹان پر قائم ہے۔ پھر ایک اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے قوم پرستی کو وسیع عالمی برادری کا ایک حصہ بنایا ہے

فی الواقع نہرو موجودہ دَور کے سب سے بڑے انٹرنیشنلسٹ بھی ہیں۔ اُنہوں نے نیشنلزم اور انٹرنیشنلزم میں نہ کبھی تضاد دیکھا ہے اور نہ اُسے اُن دونوں کے بیچ آنے دیا ہے۔ اُن کی قوم پرستی نے وویکانند، رابندر ناتھ ٹیگور اور مہاتما گاندھی کے خیالات سے وجدان حاصل کیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ آیا قوم پرستی مغرب سے مستعار ہے یا اس کی جڑیں مشرق میں ہیں، یہ یاد رکھنا لازمی ہے کہ اس فلسفہ میں امنِ عالم اور بنی نوع انسان کے مجموعی حقوق اور احساسات کا ہر جگہ خیال رکھا گیا ہے۔ نہرو کے بین الاقوامیت کے فلسفہ سے نہایت گہرے طور پر جڑے ہوئے اُن کے جنگ، امن اور ڈپلومیسی سے متعلق نظریے ہیں۔ یہاں بھی اُن کے خیالات مشترک اور مُرکّب قسم کے ہیں۔ بر عکس میکاولی کے اس نقطۂ نگاہ کے کہ بین الاقوامی امن دو جنگوں کے درمیان محض ایک وقفہ ہے جس میں دانا سیاست دان اگلی جنگ کے لئے تیاری کیا کرتے ہیں۔ نہرو پائدار عالمی امن کے خواہاں اور حامی تھے۔ اُن کا امنِ عالم کا نظریہ مہاتما گاندھی اور برٹرینڈ رسل

کے نظریوں سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی ایسا امن جس کی بنیاد انسانیت کے مفاد پر ہو، نہ کہ ہتھیاروں کی برتری پر۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے فلسفۂ قوم پرستی اور بین الاقوامیت میں جس طرح مغرب و مشرق دونوں کے دھارے کارفرما ہیں۔ اسی طرح اُن کے عالمی امن کا فلسفہ بھی اسی طرح کا ایک مرکب ہے۔ امن عالم کے سلسلہ میں اُن پر حضرت عیسیٰ اور مہاتما گاندھی کی بتائی ہوئی انسانی قدروں کا نہایت گہرا اثر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ میکاولی کے خیالات سے کبھی متاثر نہیں ہو سکے۔ کیونکہ اُنہیں ہر اُس شے سے گریز ہے جس کا انحصار تشدّد، دھوکے اور طاقت پر ہو۔

یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہرو کے ہاں مغربی اثرات محض اس طرح پڑے ہوئے نہیں ملیں گے جیسے کسی گودام میں بے ترتیب رکھی گئی چیزیں۔ اُن کے من میں یہ تمام خیالات، چاہے وہ مغرب سے آئے ہوں یا مشرق سے اُبھرے ہوں، سمندر کی لہروں کی طرح ہیں۔ متحرک اور ایک دوسرے سے وابستہ۔ مشرق میں اُن پر سب سے جدید اور بڑا اثر مہاتما گاندھی کے خیالات کا رہا ہے۔ مشرق اور مغرب کی بہترین قدریں، بدھ ازم، عیسائیت اور اسی طرح کے بلند روحانی اخلاقیات بھی اُن کے نظریات کی تہہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن

ان سب کے ہوتے ہوئے یہ امر ناقابلِ فراموش ہے کہ نہرو کے سیاسی خیالات اپنے مشرقی اور مغربی اثرات کے باوجود اُن کی عالم گیر شخصیّت کی ایک لامثال، لازوال سند لئے ہوئے ہیں۔ وہ بالآخر جواہر لال نہرو کے سیاسی خیالات ہیں۔

جواہر لال نہرو
اور
سیکولرازم

سیّد میر قاسم

پنڈت نہرو کے انتقال کا المیہ صرف ہندوستان ہی کے لئے رنج و غم کا باعث نہیں بلکہ ساری دُنیا اُن کی جُدائی کے غم میں سوگ منا رہی ہے۔ پنڈت جی ایک ایسی مشعل تھے جس کی کرنیں دُنیا بھر میں جنگ و جدل، غلامی، مذہبی اور نسلی مناقشات کے اندھیروں سے برسرِ پیکار تھیں۔ وہ جن اصولوں کو اپنا چکے تھے اُن پر آخری دَم تک عزم اور یقینِ محکم کے ساتھ عمل کرتے رہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے مدبّروں اور سیاست دانوں نے اُن کو اپنے اپنے ڈھنگ سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پنڈت جی کی عہد آفرین شخصیت کے کس قدر قائل ہیں۔

آج جس موضوع پر میں آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں وہ ہے پنڈت جی کے سیکولرازم کا بلند اصول۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر زمانے میں اس اصول

کے علم بردار پیدا ہوتے رہے اور انہوں نے مذہبی مناقشات سے بالاتر زندگی پر زور دیا۔ آپ بھگتی کی تحریک کو لیجئے یا صوفی ازم کے آدرشوں پر غور کیجئے۔ مقصد ایک ہی ہے۔ گاندھی جی نے ان آدرشوں کو اپنایا تھا اور تحریک آزادی کے دوران اُنہوں نے ان ہی آدرشوں کی بُنیاد پر ہندو مُسلمان، سکھ اور عیسائی کو بھائی چارہ سے رہنے کی تلقین کی۔ اُن کے نزدیک مذہبی مناقشات سے بالاتر رہ کر ہی سماج ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکتا ہے۔ لیکن شری نہرو نے اس اصول کو نئے اور بھرپور معنی دئیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیکولرازم کا اصول نہ صرف ہندوستانی لوگوں کو یک جہتی کے ساتھ رہنے میں مدد دے گا بلکہ جو آزادی سامراج شاہی سے ہم نے حاصل کی ہے اُس کو بھی پائدار بنایا جاسکتا ہے۔ جب یک جہتی کی بُنیاد پر مُلک کے لئے ایک اقتصادی ڈھانچہ تعمیر کیا جائے جس میں کسی قسم کی تفریق یا اُونچ نیچ باقی نہ رہے۔ سیکولرازم کا اصول یوُں تو ہمارے سماج میں صدہا سال سے کارفرما ہے، لیکن پنڈت نہرو کے خیال کے مطابق سوشلزم پر مبنی اقتصادی ڈھانچہ ہی اس اصول کو پائدار طور پر عملی شکل دے سکتا ہے۔

آخر یہ اصول کیا ہے؟ ہمارے ہندوستانی سماج کے ارتقا میں مختلف اوقات پر مختلف شخصیتوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اسے سمجھا ہے اور اس کا پرچار کیا ہے۔ اگلے زمانوں میں زیادہ زور بھائی چارہ پر دیا جاتا تھا۔ پھر سماجی اُونچ نیچ کو ختم کرنے کے

لئے اس اصول پر زور دیا گیا۔ غرض اختلاف کی بجائے ہم آہنگی پر زور دیا گیا۔ اگر انسان کے مختلف مذہبی عقیدے انسانوں کے درمیان تنازعہ اور اختلاف کی بُنیاد نہ بنے تو سیکولرازم متصوّر ہوتا ہے۔ پنڈت جی نے مُلک میں اس وسیع نظریہ کے معنی کو غیر محدود کر دیا ہے۔ مذہب کی بُنیاد پر مناقشات کو مُضر تصوّر کیا گیا اور بلا اس امتیاز کے کہ کون کس مذہبی عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے متعدد سعی و کوشش کو جمہوریت، اقتصادی آزادی اور سب سے بڑھ کر انسانی ذہن کی ترقی کا ضامن گردانا گیا۔

ہمارے مُلک کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ یہ ڈیڑھ سو سال تک بیرونی سامراج کا غلام رہا۔ اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے اور لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کے لئے سامراجیوں کو مذہبی تفرّقات کا ہتھیار ہاتھ لگا اور انہوں نے اپنی بقا کے لئے ہر وقت کوشش کی کہ مختلف مذہبوں کے پیرو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھتے رہیں۔ اُنہوں نے کوشش کی کہ نفرت کا جو بیج اُنہوں نے بویا تھا اُس کی آبیاری ہوتی رہے۔ لیکن ہندوستان کی تحریک آزادی کو وقتاً فوقتاً جو رہنما ملے۔ اُنہوں نے اس سامراجی فتنہ پردازی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور لوگوں کو یک جہتی سے رہنے کی تلقین کی۔

ابھی سامراج شاہی سے آزادی نہ ملی تھی کہ گاندھی جی اس

عظیم آدرش کے لئے اپنے ہی ایک ہم مذہب کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اپنی ساری زندگی کا مشن ہی یہ بنایا کہ وہ نہ صرف ہندوستان کو، بلکہ ساری دنیا، خاص طور سے پس ماندہ ایشیائی اور افریقائی ممالک کو اس روشنی سے منوّر کریں۔ جہاں گاندھی جی نے ہندوستان کی جد وجہد آزادی کو عوام اور اُن کے مسائل سے وابستہ کر کے معنی دئے وہاں پنڈت نہرو نے حصولِ آزادی کے بعد اُسے بھرپور طور پہ ٹھوس شکل دینے کا بیڑا اُٹھایا۔ ہندوستان کی اسی جد وجہد کا ردِّ عمل تھا کہ کشمیر میں بھی تحریک آزادی نے جنم لیا اور پروان چڑھ کر ایک سیکولر سماج کی بُنیاد ڈالی۔ اگرچہ ہماری ریاست میں صدہا سال سے ہندو اور مُسلمان اولیائے کرام اور صوفی شعرا ایک جہتی اور انسانیت کا درس دیتے رہے۔ رنگ و نسل اور کُفر و ایمان کے جھگڑوں سے بالاتر رہنے کے لئے لوگوں کو للکارتے رہے۔ لیکن سامراج شاہی کی حکمتِ عملی کے اثرات ہمارے عوام پر بھی پڑے۔ لیکن یہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی رہنمائی ہی کا نتیجہ تھا کہ ہماری آزادی کی جد وجہد کی شروعات ہی سے ہم نے سیکولرازم کو اپنا لیا اور مذہب کی بنا پر تقسیم ہونے سے انکار کیا۔ ہم صدیوں کی روایات سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے بُزرگوں کے ارشادات ہمارے سامنے تھے۔ للہ عارفہ اور شیخ نورُ الدین رح نے ہمیں تلقین کی تھی کہ ہم ایک جا ہو کر اپنی کشتی کو کنارے لگا دیں

یہ ہمارے اولیائے کرام کا سیکولر کردار ہی تھا جس کے طفیل آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی زیارت گاہوں کو کئی مقامات پر ایک ہی جگہ اور ایک ہی احاطے میں پاتے ہیں۔ لیکن سیکولرازم کے معنی اتنے ہی نہیں۔ سیکولرازم کا جو نصب العین پنڈت نہرو نے ہمارے سامنے رکھا، وہ صحیح معنوں میں جب ہی حاصل ہوگا جب ہم ایک ایسے سماج کی تعمیر کریں جہاں اونچ نیچ نہ ہو۔ نہ رنگ و نسل کی تفریق کا نام و نشان رہے۔ جہاں ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو۔ لیکن جہاں یہ مذہبی آزادی اُن کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں مخل نہ ہو۔

سیکولرازم کے آدرش پر کاربند رہنے کی ضرورت اس وقت نہ صرف ہندوستان میں ہے بلکہ پاکستان میں بھی اس کی ازحد ضرورت ہے کیونکہ جو چیز ہم اپنے لئے درست سمجھتے ہیں وہ ہماری نظر میں دوسروں کے لئے بھی درست ہی تصور ہو سکتی ہے۔ اس سے نہ صرف دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات خوش گوار رہ سکتے ہیں بلکہ یہ اُن کی تعمیر نو کی کوششوں میں بھی ممد و مددگار ثابت ہوگا۔ پنڈت نہرو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان صلح و آشتی کے متمنی تھے کیونکہ اُنہوں نے تقسیم سے پہلے کے ہندوستان کے باشندوں کی سیاسی اور اقتصادی جد و جہد کی رہبری کی

کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان کے عوام اور اُن کی حکومت نے پنڈت جی کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور اُن کے سیکولر ازم کے اصول کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔

پنڈت نہرو جمہوریت اور سیکولرازم کی بُنیادوں پر جو سماج قائم کرنے کے خواہاں تھے اُس کا مقصد یہ تھا کہ اقتصادی منصوبہ بندی کے ذریعہ ملک کو سوشلزم کی منزل کی طرف گامزن کیا جائے تاکہ مُلک کے تمام باشندے رنگ و نسل اور زبان و مذہب کے اختلافات کے باوجود یکساں مواقع سے استفادہ کر کے ایک ایسی خوش حال زندگی سے بہرہ ور ہوں جس میں بھُوک، غُربت، جہالت، بیماری، نفرت اور تعصب کا نام و نشان نہ ہو اور سماج کا ہر فرد اپنی تمام تر صلاحیتوں کو فروغ دے کر اجتماعی بہبودی کے لئے ان کو استعمال میں لاسکے۔

پنڈت نہرو قومی ترقی کی اس منزل کو ایک بین الاقوامی نظام کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ اُن کے مقاصد کا اُفق بین الاقوامیت کی سُنہری سرزمین تھی۔ جہاں جنگ و جدل کی جگہ امن و آشتی کا دَور دَورہ ہو، جہاں مختلف قومیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نہ ہوں بلکہ اُن کی حدود ایک عالم گیر انسانی قلمرو میں محو ہوتی ہوں۔ ہمیں اُن کے سیکولرازم کو اُن کے ان ہی عظیم مقاصد کی روشنی میں سمجھنا چاہیئے اور اپنی ساری کوشش کو اس کے استحکام کے لئے وقف کرنا چاہیئے۔

جواہر لال نہرو

نئے ہندوستان کے معمار

ترلوچن دت

جواہر لال نہرو نہ صرف ہندوستان کے برگزیدہ رہنما تھے بلکہ آپ دُنیا بھر کے ممتاز رہنما بھی تھے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ انسانیت، ترقی اور عالمی امن ناقابل تقسیم ہیں اور آپ ساری عمر کے دوران ان اعلیٰ اصولوں کی سرفرازی کے لئے پوری لگن اور تن دہی سے کام کرتے رہے۔ آج اگرچہ پنڈت جی ہمارے درمیان نہیں ہیں اور اس وجہ سے ہم اپنی زندگیوں میں ایک بھاری خلا محسوس کرتے ہیں تاہم ہم اپنے دلوں کے اس بادشاہ کو ہمیشہ کے لئے امر بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم اُن کے دکھائے ہوئے راستہ پر ثابت قدمی سے کاربند رہیں اور ہر قیمت پر ملک کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر ترجیح دیں۔ پنڈت جی نے زندگی بھر خود ایسا ہی کیا تھا۔ بین الاقوامی رول کے علاوہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں آپ کا عظیم الشان رول رہا ہے۔ جدید ہندوستان کے

معمار کی حیثیت سے آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

"مستقبل کی نظر ہم پر ہے۔ ہم کدھر جاتے ہیں؟ عام آدمی، کسان اور مزدور تک آزادی اور آزادی کی برکتیں پہنچانے کے لئے مفلسی، جہالت اور بیماری سے لڑنے اور انہیں ختم کرنے کے لئے خوش حال جمہوری اور ترقی پسند قوم بنانے کے لئے اور ایسے سماجی، معاشی اور سیاسی ادارے بنانے کے لئے جو ہر مرد اور عورت کو صاف اور بھرپور زندگی فراہم کرنے کے ضامن ہوں۔ ہمارے سامنے بڑا مشکل اور سخت کام ہے۔ ہم میں سے کسی کے لئے اس وقت تک آرام میسر نہیں ہوگا جب تک ہم پوری طرح اپنا عہد پورا نہیں کرتے۔ جب تک ہم ہندوستان کے تمام عوام کو وہ نہیں بناتے جو حیثیت انہیں بنانا چاہتی تھی۔ ہم ایک عظیم ملک کے شہری ہیں۔ وہ عظیم ملک جو ایک بڑا قدم اٹھانے والا ہے۔ ہمیں خود کو اس معیار کے مطابق ڈھالنا ہے۔ چاہے ہم کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہم سب ہندوستان کے بچے ہیں۔ ہمارے حقوق، مراعات اور ہماری ذمہ داریاں مساوی ہیں۔ ہم فرقہ پرستی یا تنگ خیالی کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ قوم عظیم نہیں ہو سکتی جس کے عوام خیال اور عمل میں چھوٹے ہوں۔"

جواہر لال نہرو نے یہ الفاظ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کہے تھے لیکن ان کی گونج آج بھی فضا میں باقی ہے۔ وہ کسی کو ننگا، بھوکا نہیں دیکھ

سکتے تھے۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر آدمی تعلیم یافتہ ہو، خوش اور خوش حال ہو۔ اُنہوں نے ہندوستان کو ایک عظیم قوم کا وطن بنانے کے لئے ان تھک کوشش کی۔ مہاتما گاندھی نے ہند سے غلامی، جہالت، تنگ نظری اور غریبی دُور کرنے کے لئے جو اصول مرتّب کئے تھے، جو خاکے بنائے تھے اُن کی بُنیاد پر جواہر لال نہرو نے وزیرِ اعظم اور منصوبہ بندی کمیشن کے صدر کی حیثیت سے ترقی کے منصوبوں کی تشکیل، اور اُن کو عملی جامہ پہنانے کے کام کی نگرانی کی۔ جواہر لال نہرو ہندوستان اور دُنیا کی تاریخ پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ اُن کو اس بات میں یقین تھا کہ جس نظام میں اقتدار کا سرچشمہ عوام نہ ہوں وہ نظام عوام کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اقتدار مطلق العنان حکمران کو مفادِ خصوصی پیدا کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور جہاں حکومت اور حکمران گروہ کا مفاد عوام کے مفاد سے الگ ہو جائے وہاں جبر اور تشدّد کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے سب سے پہلے عوام کے جمہوری حقوق کے تحفّظ کے لئے جمہوریت کی جڑیں مضبوط کیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کا جمہوری آئین سب سے زیادہ جواہر لال نہرو کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پنڈت جی کی نظروں میں جمہوریت بذاتِ خود کافی نہیں تھی وہ اس کی اہمیت اس لئے سمجھتے تھے کہ اس سے اقتصادی جمہوریت حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے جس کے ذریعہ عوام خود نظمی کے طور پر

چند پابندیوں کو منظور کر کے آگے بڑھتے ہیں اور اپنا معیارِ حیات بلند کرتے ہیں۔

پنڈت جی کا خیال تھا کہ سیاسی آزادی اُس وقت تک بے سود ہے جب تک عوام کو کھانے کے لئے روٹی، پہننے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے مکان میسّر نہ ہو اور بالآخر آپ اپنے بے پناہ خلوص، لگن اور عوام کے تئیں زبردست محبّت کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر انہیں اُس منزل کے قریب لے آئے جہاں سے بھرپور آزادی، خوش حالی اور پائدار امن کی جانب راہیں کھُلتی ہیں۔ یہ آپ کی اُسی جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے عوام کے دِلوں میں ایک بہتر مستقبل کی شمعیں پُورے آب و تاب سے روشن ہیں اور اُنہیں نئی زندگی کی کچھ آسائشیں اور سہولتیں میسّر ہیں۔ گو ہمارے عوام کو ابھی تک بہتر اور خوش حال زندگی کی ساری سہولتیں میسّر نہیں۔ لیکن اس بات کی توقع ہے کہ اگر ہم اپنے رہنما کے بتلائے ہوئے راستے پر گامزن رہیں گے تو وہ وقت دُور نہیں جب ہماری قومی زندگی کا دامن بہتر مستقبل کی خوشیوں اور مسرّتوں سے بھر جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء سے قبل ہمارا مُلک نہ صرف زرعی لحاظ سے ہی پچھڑا ہوا تھا بلکہ ہم صنعتی میدان میں بھی کافی پس ماندہ تھے لیکن آج یہ حالت نہیں ہے۔ ہم نے منصوبہ بند ترقی کی بدولت نہ صرف زراعت کے میدان میں نمایاں پیش قدمی کی ہے بلکہ ہم صنعتی شعبے میں بھی تیزی سے آگے قدم بڑھا رہے ہیں۔ آج بجا بجا سرزمینِ گنگ و جمن

پر نئے نئے ترقیاتی پروجیکٹوں کی صورت میں نئے مندر اور تیرتھ اُبھر رہے ہیں اور ہم ضرورت کی بیشتر چیزیں مُلک میں خود ہی تیار کرتے ہیں۔ ہماری موجودہ ترقی دوسروں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ ہمارا حال ہے زیادہ مستقبل روشن ہے اور اس ہمہ جہت پیش قدمی کے لئے مُلک اور قوم اپنے معمار جواہر لال نہرو کے احسان مند ہیں۔

پنڈت جی کی بدولت ہمارے معاشرہ کو ایک مُستحکم بُنیاد ملی ہے۔ فلاحی ریاست کے خدوخال اُبھر رہے ہیں اور ایک ملی جُلی معیشت، جس کی منزل اشتراکی نظام اور فلاحی ریاست کا قیام ہے، سماج کو ایک نئی شکل دے رہی ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر ایک دوسرے کے تال میل سے مُلک و قوم کی ضرورتیں پُورا کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ پُرانے ہندوستان سے ایک نیا اور خوش حال ہندوستان اُبھر رہا ہے۔ یہ قوم کے محبوب جواہر لال نہرو کی بہترین یادگار ہے۔ ہمیں عہد کرنا ہے کہ اس یادگار کو زیادہ شاندار بنانے اور پنڈت جی کے آدرشوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے ہم خود کو وقف کریں!

محکمہ اطلاعات حکومت جموں و کشمیر

جواہر لال نہرو کے آدرش

غلام محمد صادق

جواہر لال نہرو کی استھیوں کو آج الہ آباد میں گنگا، جمنا اور سرسوتی کے سنگم پر اور کشمیر میں سندھ ندی اور جہلم کے سنگم پر اور ملک کے دوسرے علاقوں کے دریاؤں میں بصد اعزاز و احترام سپردِ آب کر دیا گیا۔ اور استھیوں کا ایک حصہ آپ کی وصیت کے مطابق ہوائی جہازوں سے فضا میں بکھیر دیا جائے گا۔ تاکہ وہ اُن کھیتوں تک پہنچ جائے جہاں ہندوستان کے عام کسان محنت و مشقت کرتے ہیں اور اس طرح جواہر لال کے جسدِ خاکی کی باقیات کا ایک حصہ ہندوستان کی مٹی کا ناقابلِ تمیز حصہ بن جائے گا۔ جواہر لال کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جواہر لال نے ملک اور قوم کو دِل کی گہرائیوں سے چاہا اور قوم نے ان کو اپنی بے پناہ محبت دی۔ موت محبت کا رشتہ ختم نہیں

کر سکتی۔ موت نے جواہر لال کو ہم سے چھین لیا ہے لیکن اُن کی محبت ایک ایسی چیز ہے جو موت ہم سے نہیں چھین سکتی۔ جواہر لال کی موت پر ہم آپ جس طرح روئے ہیں اور دُنیا جس طرح روئی ہے اس طرح کسی اور کا غم نہیں منایا گیا ہے۔ رونا غم کا اظہار ہے۔ یہ ہم نے کیا۔ لیکن ابھی ہمیں جواہر لال سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنا باقی ہے۔ محبت اور عقیدت کا اظہار الفاظ اور آنسوؤں سے زیادہ کسی اور بات کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہمیں اپنے عمل سے یہ دکھانا ہوگا کہ ہم واقعی جواہر لال کی محبت کے اہل ہیں۔ جواہر لال ہمارے ہی نہیں بلکہ دُنیا کے لیڈر تھے۔ اُن سے عالمی امن نے اور محکوم قوموں کی آزادی کی جدوجہد نے تقویت حاصل کی۔ لیکن یہ وقت جواہر لال کی قومی اور بین الاقوامی خدمات پر تبصرہ کرنے کا نہیں ہے۔ پھر بھی ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ ملک اور قوم کو جو کچھ دیکھنا چاہتے تھے اس میں جو کمی رہ گئی ہے اس کو ہم پورا کریں۔

جواہر لال نے قوم کو ایک قوم بنایا۔ سماج، سیاست اور معیشت کو نئی اور صالح بُنیادوں پر اُستوار کرنا چاہا۔ اور اس میں اُنہیں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ زندگی ایک مُسلسل عمل اور ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ اس لئے کوئی منزل آخری نہیں ہوتی۔ جواہر لال ملک اور قوم کو آزادی، جمہوریت اور ترقی کی جس منزل تک لائے، ہم وہاں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔ خُود وہ بھی مطمئن نہیں تھے اور اس

کو ہمارے سفر کی منزلِ مقصود نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان کو اور بھی آگے لے جانا چاہتے تھے۔ جو راستہ اُنہوں نے اختیار کیا وہ صحیح ہے اور ان کے اصول ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ ہمیں ان کے راستے پر چلنا ہوگا اور اُن کے اصولوں پر چلنا ہوگا۔

جواہر لال نئے ہندوستان اور نئی ہندوستانی قوم کے سب سے بڑے معمار ہیں۔ گاندھی جی نے مُلک کو کچھ اصول دیئے اور بیداری پیدا کی۔ اور تحریک آزادی کو آزادی کی منزل تک پہنچایا۔ جواہر لال نے آزادی کو عام آدمی کے لئے معنی دیئے۔ جواہر لال کے تصوّر کا ہندوستان وہ ہے جس میں ایک آدمی بھی بھوکا، ننگا اور بے سہارا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے نزدیک سیاسی آزادی اُس وقت تک بے معنی ہے جب تک اقتصادی آزادی نہ ہو۔ یعنی ہر شخص کو معاشی انصاف، برابری اور مساوات میسّر نہ ہوں۔ یہ بات کافی نہیں ہے کہ سب کو برابر کے مواقع میسّر ہوں بلکہ یہ ضروری ہے کہ دولت کی تقسیم میں جو نابرابری ہے وہ ختم ہو۔ یہ کوئی خیالی بات نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ممکن ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور اُس کی ابتدا خوُد جواہر لال نہرو نے کی۔ یہ کام منصوبہ بندی کے تحت ترقی سے ہو سکتا ہے۔ پلاننگ کمیشن کے صدر اور وزیرِ اعظم کی حیثیت سے جواہر لال نہرو نے اس عظیم کام کے لئے پروگرام مُرتب کئے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہدایت دی۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کی دُور رس نظر والے جو پروگرام مُرتب کیا ہے اُسے پُورا کرنے سے فلاحی ریاست قائم ہو گی جو

ہمارے عظیم آئین کے ہدایتی اصولوں میں سب سے اہم ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو یہ اپنا فرض سمجھنا چاہیئے کہ ترقی کے جو منصوبے جواہر لال نے بنائے تھے ہم اُن کو آگے لے جائیں۔ جواہر لال کا دِل وسیع تھا۔ اُن کی نظر وسیع تھی۔ اُن کا مشرب وسیع تھا اور وہ یہ خوبیاں اپنی قوم میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان' دُنیا کی سب سے بڑی غیر مذہبی جمہوریہ ہے۔ تو یہ اِس وجہ سے کہ جواہر لال نے اِس کو ایسا ہی چاہا۔ اُن کا سیکولرازم کا تصوّر نئے ہندوستان کی اُن روایات کی رُوح ہے جو قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ اور جن کی وجہ سے ہندوستان کو اقوامِ عالم میں ایک بلند مرتبہ حاصل ہے۔ جواہر لال نے یہ بات بار بار کہی ہے کہ کوئی قوم اُسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب اس کے سامنے بڑے مقاصد ہوں اور بڑے مقاصد کے لئے صرف بڑے آدمی ہی کام کر سکتے ہیں۔ بڑے دولت اور طبقہ کے اعتبار سے نہیں بلکہ بڑے ان معنوں میں کہ ان کے خیال بڑے ہوں۔ ان کے دِل بڑے ہوں اور ان کے ذہن بڑے ہوں۔ جن کے ذہن تنگ ہوں' دِل تنگ ہوں' خیال تنگ ہوں' وہ صرف چھوٹی باتیں سوچ سکتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ جو لوگ چھوٹی باتیں سوچیں اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں اُلجھے رہیں وہ مُلک اور قوم کے لئے کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے۔ وہ تو مُلک اور قوم کو اپنا ہی طرح چھوٹا کر دیتے ہیں۔ حقیر کر دیتے ہیں۔ مذہب' فرقے' ذات پات'

زبان، ریاست، صوبے اور علاقے سے تعلق رکھنے والے جھگڑے ملک اور قوم کو تنزّل کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ تنگ نظری کی دلیلیں ہیں اور جواہر لال کے اصولوں کے سراسر خلاف ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم جواہر لال کی محبت کا دم بھرنے کے اہل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب ہم ہر قسم کی تنگ نظری سے دور رہیں۔ اور ہمارے دامن پہ جہاں بھی تنگ نظری کے دھبّے پڑے ہیں اُنہیں دھو ڈالیں۔ کشمیر جواہر لال کو بہت عزیز تھا اور کشمیر کو جواہر لال بہت عزیز تھے۔ کشمیر میں اور کشمیر کے باہر جہاں بھی کوئی کشمیری تھا اُس کو جواہر لال کی وفات سے بے انتہا دُکھ ہوا۔ کشمیر اور اہل کشمیر کو جواہر لال کے دل میں ایک خاص جگہ حاصل تھی اس لئے ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں جواہر لال کے آدرشوں پر چلنا اہل کشمیر کی زیادہ ذمہ داری ہے۔ یہ ہمارے لئے فخر کی بات ہے کہ کشمیر کی سیکولر روایات دوسروں کے لئے قابل تقلید نمونہ رہی ہیں۔ آیئے ہم عہد کریں کہ ہم اپنی سیکولر روایات کو مستحکم رکھیں گے۔ فلاحی ریاست کے قیام کے لئے ان تھک کوششیں کریں گے اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک سماج سے ہر بد عنوانی اور نابرابری دور نہ ہو۔ اور ہر فرد کو معاشی اور سماجی انصاف اور مساوات میسّر نہ ہو۔ ہم ہر قیمت پر اپنے ملک کی آزادی اور سالمیت کی حفاظت کریں گے۔

جواہر لال نہرو
کو
خراجِ عقیدت

ڈاکٹر کرن سنگھ

ہمارے دِلوں میں ایک خلا سا پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ جواہر لال نہرو ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اب ہم کبھی اُن سے ہدایات اور رہبری حاصل نہ کر سکیں گے۔ نہ ہی اُن کی روشن اور تابناک شخصیت سے ہم مِل سکیں گے۔

کشمیر کی اس خوبصورت وادی میں، جہاں سے کہ اُن کے آبا و اجداد صدیوں پہلے مُلک کے دوسرے حصوں میں چلے گئے تھے، اب ہم اُن کی بے تکلّف اور انتہائی مُحبّت بھری شخصیّت کو دوبارہ نہیں دیکھ پائیں گے۔ ہماری اس ریاست کے لئے اُن کے دِل میں ایک خاص محبت تھی اور جب بھی اُن کو موقعہ مِلتا تھا تو وہ ان پہاڑوں کے درمیان، جن کے ساتھ اُن کو بے حد لگاؤ تھا، کچھ دِن بسر کرنے یہاں

آتے اور تازہ دم اور صحت مند ہو کر واپس دِلّی جاتے تھے۔

اُس نیک اور بلند خیال شخص کی یاد، جو کہ دُنیا کا ایک بڑا رہنما اور حقیقی انسان دوست بھی تھا، ہمارے دِلوں میں رہتی دُنیا تک ایک بیش بہا خزانے کی مانند قائم رہے گی۔

پچھلے تیرہ ایّام کے دَوران تمام مُلک میں سوگ اور غم کے دِل خراش مناظر دیکھنے میں آئے۔ ایک انسانی آنکھ نہ تھی جو اس عظیم سانحہ سے پُرنم نہ تھی۔ ایک دِل نہ تھا جو کہ اس غم سے افسردہ نہ ہوا۔

جواہر لال نہرو کی استھیاں مُلک کے طول و عرض میں بکھیر دی گئیں اور مُلک کے تمام دریا، جو کہ ہماری دھرتی کو سیراب کرتے ہیں، اُن کی پوتر استھیوں سے اور بھی متبرک ہو گئے۔

اُن کی یاد میں بہت سی یادگاریں قائم کی جائیں گی۔ مگر جواہر لال نہرو کی حقیقی یادگار، جو کہ ہم اپنے دِلوں کے اندر قائم کریں وہ یہ ہے کہ ہم اس بات کا عہد کریں کہ ہم اُن اصولوں کے لئے، جن کی خاطر وُہ جیئے اور جن کی خاطر اُنہوں نے ساری عمر کام کیا، ہم بھی اُن کے اصولوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کر لیں اور بھارت کو اُن کے آدرشوں کے عینِ مطابق تعمیر کرنے کا عہد کریں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے اصول تھے جن کی خاطر انہوں نے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک اپنی ان تھک جدوجہد جاری رکھی۔ میرے دِل میں اُن کی زندگی کے نُمایاں پہلو ہیں قومی یک جہتی، پارلیمانی جمہوریت، سماجی آزادی اور اقتصادی ترقی، جس کا دارومدار سائنس اور ٹیکنالوجی پر ہے۔ وہ سماج واد، جمہوریت اور عالمی برادری کے اصولوں سے بخوبی واقف تھے۔

ہمارے مُلک کی ایکتا (جو کہ ایک طرف کشمیر سے کنیا کماری تک اور دوسری طرف گجرات سے آسام تک پھیلا ہوا ہے) اُن آدرشوں ہی کا نتیجہ ہے جن کے لئے پنڈت جی نے ان تھک کام کیا۔ وہ ہمیشہ تنگ نظری اور صوبائی تعصّب جیسی خرابیوں سے بے حد نفرت کرتے تھے کیونکہ ایسی چیزیں مُلک کی سالمیت بنائے رکھنے میں مانع ہو سکتی تھیں۔ وہ کبھی یہ کہتے ہوئے تھکتے نہ تھے کہ وطن کی محبّت کو باقی سبھی چیزوں پر ترجیح دی جانی چاہیئے۔ اتحاد و اتفاق کو ہر صورت میں قائم رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اتحاد ہی سے ہماری طاقت قائم رہ سکتی ہے اور ہمارا مستقبل شاندار بن سکتا ہے۔

بہت سی پیشین گوئیاں ہوئی تھیں کہ اُن کے مرگباش ہونے کے بعد ہمارے مُلک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ ایسا نہیں ہُوا۔

یہ یقیناً اُن کے تئیں خراجِ عقیدت ہے۔ کیونکہ آزادی حاصل کرنے کے بعد جواہر لال نہرو کی قیادت میں سارے مُلک میں اتحاد قائم ہوا۔ اور لوگوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا ہے۔ جس کی بدولت آزادی برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اب لوگوں نے باہمی اتحاد قائم کرنے کا پکّا ارادہ کر لیا ہے۔

مُلک کے سرکردہ قانون دانوں نے، جن میں پنڈت جی سب سے آگے تھے، بڑے غور و فکر کے بعد ہمارے مُلک کے لئے ایک پارلیمانی جمہوری طریقِ کار کو اپنایا۔ ہمارے آئین میں ہر فرد کی آزادی اور اُس کی عزت کے تحفّظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ پچھلے سترہ برسوں کے دوران، جب کہ پنڈت جی مُلک کے وزیرِ اعظم تھے، اُنہوں نے مُلک میں پارلیمانی طرزِ حکومت کو ایک غیر معمولی طریقے سے مُستحکم بُنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ وہ بذاتِ خُود ایک بے لوث پارلیمنٹیرین ہونے کے ناطے جمہوری قدروں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس طرح سے ہندوستان میں بھی ایک مُستحکم جمہوریت قائم ہوئی۔

مجھے اُن کے سرگباش ہونے کے بعد تھوڑے عرصے کے لئے پارلیمنٹ جانے کا موقعہ مِلا۔ اُن کے سرگباش ہونے کے صدمے سے پارلیمنٹ کسی حد تک سنبھل گئی تھی اور لوگ سمجھا میں معمول کی طرح کام ہو رہا

تھا۔ یہ بجائے خود جواہر لال نہرو کی اُس کامیابی کے لئے بہت بڑا خراجِ عقیدت ہے جو کہ اُنہوں نے مُلک کے اندر پارلیمانی نظام مضبوط بنانے میں حاصل کرلی۔

پنڈت جی صرف سیاسی آزادی کو ہی کافی نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کی نظر میں ایک سماجی انقلاب تھا جس کی بدولت تمام ذات اور رنگ کی شکستہ دیواریں ٹوٹ کر گر جائیں اور قوم کا ہر فرد ایک آزاد مُلک کے آزاد شہری کی حیثیت سے سماج میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔ اس سلسلے میں پنڈت جی نے اپنی ان تھک کوششوں سے لوگوں کے دِلوں میں تعصّب کو ختم کرنے کے لئے اپنا کام جاری رکھا۔ اور اُنہوں نے گاندھی جی کے اُس نظریہ کو اور آگے بڑھایا جس سے کہ ہریجنوں اور دوسرے پس ماندہ طبقوں اور جماعتوں کا سُدھار ہو۔ وہ ہمیشہ اس بات پر بے حد زور دیتے تھے کہ ناخوشگوار اور شرمندہ کرنے والے سماجی تفرقات سے لوگوں کو چھٹکارا مِلے۔ غریبوں اور محتاجوں کی بھلائی کے لئے پنڈت جی کے دِل میں بڑی تڑپ تھی۔ وہ اُس بھارت کی تعمیر کے خواہاں تھے جس میں کوئی بچّہ بھوکا یا اَن پڑھ نہ ہو۔ کسی عورت کے تن پر ناکافی لباس نہ ہو۔ وہ بے گھر نہ ہو۔ اور کوئی مرد بے روزگار نہ ہو۔ ان سب چیزوں کے حاصل کرنے کے لئے

پنڈت جی نے محسوس کیا کہ مُلک میں ایک معاشی انقلاب لانے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرنے میں وہ پوری طرح سے اس بات کے قائل تھے کہ آج کل کی دُنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو نہایت ہی اہم مقام حاصل ہے۔ تاریخ اور انسانی زندگی کے سلسلے میں سائنسی نظریے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُنہوں نے معاشی مسائل حل کرنے کے لئے قومی منصوبہ بندی کی داغ بیل ڈالی۔ منصوبہ بندی کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے حصولِ آزادی کے بعد مُلک میں معاشی تعمیر نو کی بُنیادوں کو مستحکم کیا اور عام لوگوں کو موجودہ ٹیکنالوجی کی اہمیت کا احساس دِلایا۔ وہ سماجی مساوات کے اصول پر ثابت قدم رہے اور وہ چاہتے تھے کہ اس طریقے سے معاشرے کا کام ہو تاکہ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ اقتصادی لحاظ سے سماج کے پچھڑے ہوئے طبقوں کی بھلائی کی طرف خاص طور پر دھیان دیا جائے۔ ایک غیر معمولی طریقہ پر پنڈت جی کی ذات ایک معقول، جدید اور قاعدہ پرست سائنس دان اور ایک عالم اور ایک پختہ نظر فلسفی کا خوش گوار مجموعہ تھی۔

سیکولرازم ہمارے آئین کی بُنیادوں میں سے ہے اور یہ وہ اصول تھا جس کی طرف پنڈت جی نے خود کو بڑی لگن کے ساتھ وقف کر

دیا تھا۔ کوئی ایسی بات، جس میں مذہب کی بُنیاد پر تکلیف یا ترجیح
دینے کا ہلکا سا اشارہ بھی ہو، ان کے لئے نا قابلِ قبول تھی۔ اور وہ
اس بارے میں کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ خیال کرتے
ہوئے کہ بھارت مختلف جاتیوں اور مختلف مذاہب کی ایک قوم ہے
وہ انتہائی ضروری سمجھتے تھے کہ مُلک میں جمہوری طرز کا سماج وادی
نظام مستحکم بُنیادوں پر قائم کیا جائے۔ لیکن سماج وادی نظام سے
اُن کی وابستگی کسی بھی صورت میں مطلب پرستی کی خاطر نہ تھی۔ وہ
اس بات پر پُوری طرح یقین رکھتے تھے کہ مذہب ہر فرد کا اپنا معاملہ
ہے اور ریاست کو سختی سے کسی خاص مذہبی فرقے کی حمایت سے
احتراز کرنا چاہیئے۔

آخر میں ایک عظیم بین الاقوامی لیڈر کی حیثیت سے ان کا رول
ہے۔ اگرچہ وہ بھارت کی بھلائی کی طرف ہمہ تن معروف تھے مگر اس
کے باوجود اُن کا نظریہ مُلک کی حدود تک ہی محدود نہیں رہا۔ یہ اُن
سے بہت آگے ایشیا اور افریقہ کے اُبھرتے ہوئے لوگوں تک اور
اُن سے آگے تمام انسانیت سے ہم کنار ہونے کو بڑھ گیا تھا۔

پنڈت جی اپنی صدی کے اور کسی شخص کی نسبت ایٹمی جنگ کی
تباہ کاریوں سے زیادہ اچھی طرح واقف تھے۔ بارہا اُنہوں نے بہ حیثیت

ایک دانشور ہے کے اپنی آواز امن بنائے رکھنے کے حق میں اُٹھائی۔ خاصکر جب دُنیا ایک ایٹمی جنگ کی تباہ کاری کی زد میں آنے والی تھی اور اس طرح سے انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد دُنیا میں سرد جنگ کی کشمکش کو کم کرنے میں ایک نمایاں رول ادا کیا۔ وہ ہر جگہ کے دبے ہوئے لوگوں کے ایک نڈر ترجمان تھے اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف اُن کی آواز نے موجودہ زمانہ کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ وہ دُنیا میں ایک پُرامن ماحول قائم رکھنے کے شیدائی تھے اور وہ چاہتے تھے کہ سبھی قوموں میں انسانی نسل کی بہبود کے کام کو اوّلین مان کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون قائم رکھیں۔ اور یہ وہ بلند نظریہ تھا جس کی بدولت ان کو اپنے مُلک کے علاوہ ساری دُنیا میں محبّت اور عزّت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

یہ کچھ اصول اور مقاصد تھے جن کے لئے جواہر لال نہرو نے زندہ رہ کر کام کیا۔ آج وہ جسمانی طور ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن اُن کی آتما زندہ اور اُن کے اصول ہمارے سامنے کام کرنے کے لئے ہیں۔ اگر ہم صرف زبان سے ہی اُن سے بچھڑ جانے پر افسوس کا اظہار کریں تو یہ اُن کی یاد کے ساتھ تو ناانصافی ہو گی ہی، لیکن اس سے زیادہ یہ خود ہماری طرف سے اپنے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ ہمیں عہد کرنا چاہیئے کہ ہم جواہر لال نہرو کے اصولوں پر ثابت قدمی سے چلیں گے۔

جواہر پارے

جواہر لال نہرو

ہمارا فرض

پریسیڈنسی کالج مدراس میں تقریر ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء

میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہم فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری آبادی کی حیثیت سے اپنے ملک کی اور اپنے آپ کی خدمت کریں تو ہم دنیا کی خدمت کرنے کے قابل بھی بن سکیں گے۔

ہم ایک ایسی قوم ہیں جو آپ کو فرقوں، ذاتوں اور ہر قسم کی رکاوٹوں میں تقسیم کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔ اس رجحان نے ماضی میں ہمیں کمزور کر دیا تھا۔ جب تک ہم اس پر قابو نہ پالیں۔ یہ ہمیں مستقبل میں بھی کمزور کرتی رہے گی۔

ہندوستان میں پھلنے پھولنے کی صلاحیت اس وجہ سے ختم ہو گئی کہ اس نے کئی سو برسوں تک باقی دنیا سے اپنے آپ کو جسمانی اور ذہنی طور پر الگ کر لیا تھا۔ ہندوستان میں جمود پیدا ہو گیا۔ یہ اپنے آپ

پر فخر کرنے لگا اور باہر کی دنیا سے اس نے کوئی علاقہ نہ رکھا۔

اگر آپ نے انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے تو آپ جانتے ہوں گے کہ انجام کار اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ کسی قوم کے پاس کتنا سونا اور چاندی ہے۔ لوہے، کوئلے اور دوسری قدرتی دولت کی طرح جو ایسے وسائل کسی ملک کے پاس ہوتے ہیں وہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک کے انسان کیسے ہیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے ملکوں نے شوکت و عظمت حاصل کی ہے۔ اس کی وجہ ان کے ملک کے انسانوں کی اعلیٰ صفات تھیں، تعداد نہیں۔

گزشتہ زمانے میں کسی ملک کے انسانوں کی کچھ خوبیوں نے اس ملک کی قوم کو اوپر اٹھایا۔ ہندوستان کی تاریخ کے زمانے صرف جنگجو بادشاہوں اور قابل ذکر فتوحات کے زمانے نہیں ہیں بلکہ فنی ارتقاء کے زمانے بھی ہیں۔ آزادی کے بعد ہم معاشی مسائل سے برسرِ پیکار ہیں تاکہ ۳۶ کروڑ آدمیوں کو اوپر اٹھائیں۔ اگر ہمیں کامیاب ہونا ہے اور قوم کو ترقی کرنی ہے تو ہمیں اپنے لوگوں میں کچھ خوبیاں پیدا کرنی ہوں گی۔

ہندوستان میں ہمیں گوناگوں مسائل کا سامنا کرنا ہے شمال میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور لداخ اور کشمیر سے لیکر کنیا کماری تک طبعی اور ارضیاتی ساخت، آب و ہوا، انسان اور بہت سی دوسری چیزوں میں کافی فرق ہے۔ سیاسی طور سے ہم ایک ہیں۔

لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام عناصر کو اور زیادہ گہرے طور پر متحد کر دیں۔

ہم زبردستی یک رنگی پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ یہ ایک قابل نفرت بات ہوگی۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی رنگا رنگی کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جو کہ ہندوستان کی مٹی کی پیداوار ہے لیکن اس کے ساتھ ہم ان مختلف عناصر کو ذہنی اور جذباتی لحاظ سے متحد کرنا چاہتے ہیں تمام قسم کی فرقہ دارانہ، مذہبی یا ذات پات کی بندشوں اور رکاوٹوں کو دور کرنا چاہتے ہیں جو ہمیں الگ کرتی، ایک ساتھ مل کر کام نہیں کرنے دیتی اور ہم میں تنگ نظری پیدا کرتی ہے۔ تنگ نظری ہماری ترقی کو روکتی ہے۔

اگر واقعی ہمیں بڑے بڑے کام انجام دینے ہیں اور ہم نے ایسے کاموں کی انجام دہی اپنے ذمّے لی ہے تو ہمیں ہر لحاظ سے بڑا بننا ہوگا اور قلب و نظر کی وسعت سے کام لینا ہوگا۔ بڑے کاموں کو انجام دینے کے لئے ہمیں اپنے قد و قامت میں بھی بلندی لانی ہوگی۔

قومی یکجہتی

(۱)

۲۲ ستمبر ۱۹۵۷ء کو مرکرا میں کی گئی تقریر سے اقتباس

میں سارے ہندوستان میں گھومتا رہتا ہوں اور اس ملک
رنگارنگی اور تنوع کا نظّارہ مجھے بے حد پسند ہے۔ ہندوستان
تنوع اور اتحاد دونوں اہم ہیں۔ تنوع سے خوش حالی آتی ہے
اتحاد بے حد ضروری ہے۔

ہندوستان کی وحدت وہ بنیادی حقیقت ہے جسے آج بھی
ت حاصل ہونی چاہیئے۔ اس کی وجہ سے اس عظیم ملک کے سبھی
والے کورگ یا میسور یا کسی خاص ریاست یا حصے کے نہیں بلکہ
لک کے شہری بن جاتے ہیں۔

اگر آپ کسی دوسرے ملک جائیں تو آپ کو جمہوریۂ ہند کے

شہری ہونے کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ کے پاس حکومت ہند
کا پاسپورٹ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے دوسرے ملک کے لوگ آپ کے
ساتھ عزت سے پیش آتے ہیں۔ غیر ملکوں کے زیادہ تر لوگ ہندوستان
کی مختلف ریاستوں کو نہیں جانتے لیکن وہ ہندوستان سے واقف
ہیں۔ اس لئے ہمیں بھارت کی بنیادی حقیقت کو ہمیشہ عزیز رکھنا
چاہیئے اور ملک میں جو بہت سی حد بندیاں ہیں ان میں نہ کھو
جانا چاہیئے۔

اگر ہم ترقی کریں گے تو پھر سارا ہندوستان ترقی کرے گا
ہندوستان کا کوئی ایک حصہ نہیں۔ اگر سارا ہندوستان پستی کی طرف
جاتا ہے تو ہم سب پستی کی طرف چلے جائیں گے۔

ہم ہندوستان کی تاریخ کے ایک عظیم دور میں رہ رہے ہیں۔
پوری قوم آگے بڑھ رہی ہے اور اسے راستے میں کٹھنائیوں کے بڑے
بڑے پہاڑوں کو پار کرنا ہے۔ اس کے لئے سخت محنت اور اس سے
کہیں زیادہ اتحاد، تعاون اور ضبط و نظم کی ضرورت ہے۔
یہ ہند کے لئے برا ہوا جب اس نے اپنے دروازے بند کر لئے
اور یہ بھی برا ہوا کہ اس نے ذات پات جیسی بندشوں کو قبول کر لیا
جس نے ایکتا کے احساس کو نقصان پہنچایا۔ ہر وہ چیز جو الگ
کرتی ہے خراب ہے اور جو متحد کرتی ہے وہ اچھی ہے۔ ہمیں اپنے

دروازے اور کھڑکیاں کھول دینی چاہئیں تاکہ دنیا کے ہر طرح کے خیالات اندر آسکیں اور ہم دنیا کے ہر حصّے سے کچھ نہ کچھ سیکھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے وفادار بھی رہیں۔

سائینس اور ٹیکنالوجی، ایٹم بم اور تیزی سے تبدیل ہونے والے اس زمانے میں بھی ہمیشہ کی طرح یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے عوام کے کردار کو بہتر بنائیں۔ یہ بھی اہم ہے کہ ہم اپنے طور طریقے، نظم و ضبط، سماجی تنظیم اور تعاون و اشتراک کا اعلیٰ معیار برقرار رکھیں۔

قومی یکجہتی

(۲)

۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو مدراس میں ورکرس ریلی کے موقع پر کی گئی تقریر سے اقتباس

جب ہم ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے تو یہ پورے ہندوستان کی لڑائی تھی۔ یہ لڑائی ہندوستان کے ایک حصّے کی آزادی مدراس۔ بنگال یا بمبئی یا اتر پردیش یا پنجاب کی نہیں تھی۔ ہم نے پورے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ ہم نے ہندوستان میں ایک عظیم جمہوریہ قائم کی۔ جس کے یہ تمام پردیش حصّے ہیں۔ اور ہم سبھوں کو ہندوستان کی اس جمہوریہ کے شہری ہونے پر فخر ہے۔ اگر ہم پورے ملک کے مفاد کو بھول جائیں اور صرف کسی ریاست یا فرقے یا ذات یا زبان

کے بارے میں سوچیں تو حالات ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں اور ہم غلط راستوں پر بھٹک جائیں گے۔

قومی جد وجہد کے زمانے میں ہم میں ایسا اتحاد تھا جو ہر ریاست، ہر مذہبی گروہ، ہر ذات اور لسانی گروہ کو ایک دھاگے میں باندھے ہوئے تھا۔ اس اتحاد نے ہمیں آزادی دلائی۔ اب ہم ہندوستان کی غریبی کے خلاف جنگ کرنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ ہم معاشی لحاظ سے ترقی کر سکیں۔ لہذا اگر ہمیں اس لڑائی میں کامیاب ہونا ہے تو سبھوں کو مل کر اس کے خلاف لڑنا ہو گا۔

ہم ہندوستان میں اشتراکی نمونے کا سماج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے ہر مرد اور عورت اور بچے کو یکساں مواقع میسر آئیں اور ان میں جو اونچ نیچ اور امیری غریبی کا فرق ہے وہ ختم ہو جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو تربیت، تعلیم اور سیکڑوں دوسرے طریقے سے بہتر بنانا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے خیالات اور جذبات کی تنظیم کس طرح کرتے ہیں۔ ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں اور ایک ساتھ کام کرنے کے لئے ہم اپنی صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لاتے ہیں۔ سوشلزم کا مطلب تعاون واشتراک اور تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔ خاص بات یہ یاد رکھنے کی ہے۔ کہ ہم یہ تبدیلیاں پُرامن طور سے اور باہمی اشتراک کے ذریعے حاصل

کرنا چاہتے ہیں۔

جب کبھی میں مدراس آتا ہوں بہت خوشی سے آتا ہوں کیونکہ میں مدراس کو پُرجمال شہر پاتا ہوں یہاں سکون اور وقار کی فضا اور گہری سمجھداری کی خوبی نظر آتی ہے۔ لیکن گزشتہ چند مہینوں میں کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں جو شہر اور ریاست مدراس کی شہرت کے بالکل برعکس ہیں۔ مجھ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں۔ اس کے مطابق یہاں کی ایک تنظیم دراوڑ کازگم کے لیڈر قتل اور بغاوت کا پرچار کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کا دستور اور ہندوستان کا جھنڈا جلا دیا جائے۔ ہندوستان کا کوئی بھی آدمی خواہ وہ کتنا ہی بڑا یا بلند مرتبہ کیوں نہ ہو۔ یہ باتیں کہنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ اگر کوئی صحیح الدماغ آدمی ہندوستان کی آزادی ہندوستان کا جھنڈا اور ہندوستان کے دستور کو چیلنج کرے تو یہ بغاوت ہے اور اس کو صریحاً بغاوت سمجھنا چاہیئے کچھ اور نہیں۔ یہ صرف مدراس شہر مدراس کی ریاست کے لئے ہی چیلنج نہیں ہے بلکہ پورے ہندوستان کے لئے ایک چیلنج ہے اور چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ہندوستان اس کو برداشت نہیں کرے گا۔

مذہبی رواداری

ملوراٹئے کے نزدیک گاندھی گرام میں کی گئی ایک تقریر سے اقتباسات

(۸ر دسمبر ۱۹۵۰ء)

یہاں بیٹھ کر ان پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے جو ہمارے چاروں طرف ہیں مجھے شمالی ہندوستان کے پہاڑوں اور برف سے ڈھکے ہوئے ہمالیہ کا خیال آتا ہے۔ ہمیں اپنے اس عظیم دیش بھارت اور اس میں بسنے والے لاکھوں، کروڑوں آدمیوں کا بھی خیال آتا ہے جو دیکھنے میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں لیکن سب لوگ سینکڑوں طریقوں سے ایک بندھن میں بندھے ہوئے ہیں اور آج سب مل کر نئے بھارت کی تعمیر کے مہان کام میں لگے ہوئے ہیں۔

کیا آپ کو وہ زمانہ یاد ہے جب ہم سب آزادی کی جد و جہد میں لگے ہوئے تھے اور جب اس عظیم ملک کے طول و عرض میں اپنے مہان نیتا مہاتما گاندھی کی قیادت میں ملک کے اس حصے سے اس حصے میں آیا جایا کرتے تھے۔ خواہ ہمارا حلقۂ عمل اتر تھا یا دکھن، پورب تھا یا پچھم لیکن اس وقت ہم پورے ملک کی آزادی کے لئے کام کر رہے تھے۔ اور ہم نے پورے ملک کو آزاد کرایا۔ ہم

نے محسوس کر لیا تھا کہ ہم سبھوں کی قسمتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور اس لئے یا تو ہم سبھوں کی آزادی حاصل کریں یا پھر آزاد نہ ہوں۔ اس طرح ہم نے ایک ساتھ کام کیا۔ ایک ساتھ قربانیاں دیں اور ایک ساتھ آزادی حاصل کی۔

اب ہمارے سامنے اس سے بڑا مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں نئے بھارت کی تعمیر کرنی ہے۔ جس میں غریبی، دکھ اور تکلیف اور بے روزگاری کا خاتمہ کرنا ہے اس کے لئے ہمیں بھی ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔

ہمالیہ سے لیکر کنیا کماری تک پورا ہندوستان ہم میں سے ہر ایک کا ہے۔ اس مہان دیش کے ہم سب مشترک وارث ہیں۔ مختلف ریاستیں ہمیں الگ الگ نہیں کرتیں جس طرح مختلف اضلاع ہمیں الگ نہیں کرتے۔ نہ ہی مختلف زبانیں ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہیں۔ ہندوستان کی تمام بڑی زبانیں پرانی ہیں، کافی دنوں سے رائج اور ترقی یافتہ ہیں۔ یہ زبانیں آپس میں بہنیں ہیں ہمیں ان سبھوں کی مدد کرنی ہے۔

اس ملک میں بہت سے مذاہب بھی ہیں اور عام طور سے مختلف مذاہب کے لوگ اس ملک میں ہزاروں برسوں سے پرامن طریقے سے رہتے آئے ہیں۔ ایک مذہب والوں کا دوسرے مذہب والوں سے رواداری برتنا ہندوستان کی روایت رہی ہے۔ یہ

ہندوستانی تہذیب کی بنیادی خصوصیت تھی۔ اس کے باوجود کچھ لوگوں نے ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے مذہب کو نعرۂ جنگ بنا دیا ہے۔ ان لوگوں نے مذہب کو رسوا کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے فرقہ وار تنظیمیں بنالی ہیں اور سیاست میں مذہب کو لے آئے ہیں اس سے ہمارے ملک کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ ہمیں صرف اپنے مذہب کی نہیں بلکہ دوسروں کے مذہب کی بھی عزت کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کے ایک عظیم فرماں روا اشوک نے جو ۲۳۰۰ برس قبل گزرا ہے کہا ہے کہ جو کوئی دوسرے مذہب کی عزّت کرتا ہے وہ ایک طرح سے اپنے ہی مذہب کی عزت کرتا ہے اور اس طرح وہ دوسروں سے بھی اپنے عقیدے کی عزّت کرا لیتا ہے لیکن اگر لوگ دوسروں کے مذہب کی عزّت نہیں کریں گے تو ان کے مذہب کی بھی عزّت نہیں کی جائے گی۔ اس طرح مذہبی رواداری کا یہ سبق ہندوستان میں صدیوں سے پڑھایا گیا ہے۔

مجھے ذات پات کا طریقہ پسند نہیں ہے۔ میرا خیال ہے گزشتہ کئی سو برسوں میں ذات پات ہندوستان کے لئے ایک لعنت ہی رہی ہے۔ اس نے ہندوستان کو کمزور کر دیا۔ اس سے ہندوستان پست ہو گیا اور ہم غیر ملکی حملہ آوروں کے غلام بن گئے۔ کیونکہ ذات پات نے ہمیں خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اس وجہ سے ایکتا اور اتحاد کے جذبات فنا ہو گئے۔ ذات پات نے

ہمارے ملک کے بہت سے لوگوں کو گھٹیا اور کم تر بنا دیا۔ ہم میں بہت سے لوگوں نے اس لعنت کو مسلط کیا اور بہتوں نے اس پستی کو قبول کر لیا۔ ماضی میں ذات پات سے جو بھی فائدے رہے ہوں لیکن آج کی دنیا میں ذات پات یا ذات پات کے طریقے (سسٹم) کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہمارے مقاصد کیا ہیں؟ حصول آزادی کے بعد ایک سفر ختم ہو گیا۔ لیکن دوسرا لمبا سفر شروع ہو گیا۔ یہ ہندوستانی عوام کا سفر ہے۔ جو غریبی کو ختم کرنے، سماجی اور معاشی ترقی کرنے اور ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے شروع ہوا ہے۔ ہمارا مقصد ایک اشتراکی سماج قائم کرنا ہے جس میں بڑی حد تک مساوات اور برابری ہو گی ور تمام لوگوں کو یکساں مواقع ملیں گے۔ ہم اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے اگر ہم اپنے سماج کو ذات پات کے طبقوں میں بانٹ دیں۔ کیونکہ ذات پات کا طریقہ صرف سوشلزم کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ مساوات اور ساتھ کام کرنے کے تمام تصورات کے بھی خلاف ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ذات پات کا بھید بھاؤ ہمارے سماج میں بہت سے لوگوں میں بڑی گہری جڑ پکڑ چکا ہے اور اس کو بالکل ختم کر دینا آسان نہیں ہے لیکن ہمیں اس کو اکھاڑ پھینکنا ہے خواہ اس میں کچھ وقت بھی لگے۔

حال میں رام ناتھ پورم کے ضلع میں بڑے زبردست فسادات

ہوئے ہیں۔ بہتیرے لوگ مارے گئے۔ کافی جائداد کو نقصان پہنچا اور بہت سے لوگوں کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ مختلف ذاتوں کے لوگوں کے درمیان ہونے والے یہ فسادات ہمارے لئے بڑے ہولناک تھے۔ اس نے ہمیں دکھا دیا کہ کس طرح ذات پات کے فرق سے ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے ان کی وجہ سے ہر آدمی سوچنے لگا کہ ذات پات کو باقی رکھنے میں کتنے خطرات ہیں اس لئے ہمیں اس لعنت سے چھٹکارا پانا چاہیئے اور اس کو ختم کر دینا چاہیئے۔

اِتحاد کی ضرورت

(۸ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ڈنڈی گل میں کی گئی تقریر کے کچھ حصے)

یہاں سے بیٹھے بیٹھے میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے ایک ساتھ مندر، مسجد اور گرجا کی تصویر بنائی ہے جسے بجلی نے روشن کر رکھا ہے۔ یہ مذہبی اتحاد کی علامت ہے اور میں اس کے لئے آپ کو مُبارک باد دیتا ہوں۔ ہم نے طے کر دیا ہے کہ ہر شہری کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا جین یا بدھ، یا اس کا کوئی مذہب نہ ہو، یکساں حقوق حاصل ہیں۔ ہم سب ہندوستان کے شہری ہیں اور ہمیں ایک ساتھ کام کرنا ہے۔ کوئی بھی شخص جو ریاست

یا مذہب یا زبان کے نام پر مشکلات پیدا کرتا ہے۔ ہندوستان کی کوئی خدمت نہیں کرتا بلکہ اپنی ریاست یا مذہب یا زبان کی بدخواہی کرتا ہے۔

یاد رکھئے کہ ہر وہ چیز جو ہمیں الگ کرتی ہے یا ہم میں جھگڑے پیدا کرتی ہے وہ بُری ہے اور ہر وہ چیز جو ہمیں متحد کرتی ہے اور ایک دوسرے کے نزدیک لاتی ہے وہ اچھی ہے۔ اس کسوٹی پر اپنے ہر مسئلے کو پرکھئے۔ یہ ایک اچھی کسوٹی ہے۔

حال میں خاص طور سے جنوبی ہندوستان سے بعض اوقات ایک نیا شور سننے میں آتا ہے اور وہ شور ہے شمال کی آمریت کا، ہندی کی آمریت کا اور اس بات کا کہ شمالی ہندوستان جنوبی ہندوستان پر غالب آنا چاہتا ہے۔ یہ مشکلات پیدا کرنے، ہندوستان کو ٹکڑوں میں بانٹنے اور انتشار پیدا کرنے کی پرانی کوشش کی دوسری شکل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی ہندوستان میں بہت سے ایسے نادان اور شرارت پسند لوگ ہیں جو غلط اور احمقانہ باتیں کہتے ہیں۔ جیسے جنوبی ہند کے بہت سے بے وقوف اور شرارت پسند لوگ کہتے ہیں۔ ہم ایک سخت اور بے رحم دنیا میں رہ رہے ہیں اور اگر ہم مضبوط اور متحد نہیں ہو سکے تو ہم رگڑ جائیں گے۔ میں یہ بات آپ سے بار بار کہتا ہوں کیونکہ میں چاہتا ہوں

کہ آپ اچھی طرح سے یہ محسوس کرلیں کہ ہمارا اصل دشمن کوئی باہری نہیں بلکہ یہ ہماری اپنی کمزوریاں اور ناکامیاں ہیں۔

رواداری۔ ہماری روایت (۱)

آزاد میموریل لیکچرس سے اقتباسات جو نئی دہلی میں ۲۲ اور ۲۳، فروری ۱۹۵۹ء کو 'بھارت آج اور کل' کے عنوان سے دیئے گئے تھے۔

جب اسلام ہندوستان میں فاتحانہ داخل ہوا تو اپنے ساتھ کشمکش بھی لایا۔ اس کے دُہرے اثرات پڑے۔ ایک طرف اس نے ہندو سوسائٹی کے اس میلان کو تقویت پہنچائی کہ وہ اور زیادہ سکڑ کر اپنے محافظ خول کے اندر پناہ لے۔ دوسری طرف وہ تازہ ہوا اور نئے تصوّرات لایا۔ اس طرح اس نے زندگی کی نئی قوت پیدا کی۔ بودھ مت کے برعکس جو ہندوستانی فکر کی ایک اور عظیم پیداوار ہے۔ ہندوستانی سوسائٹی کا نظام ہر طرف سے بند تھا۔ مسلمان بھی جو باہر سے آئے اپنے ساتھ ایک ایسا نظام لائے، جس کے دروازے دوسروں کے لئے بند تھے۔ اس طرح دو نظام ملے جو ایک دوسرے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اتنا طاقت ور نہیں تھا کہ دوسرے کو ختم کر دیتا یا اس پر حاوی ہو جاتا۔ سیاسی کامیابی کا نتیجہ یہ نہیں نکلا کہ ذہنی اخلاقی

یا مذہبی فتح بھی حاصل ہوتی۔ قدیم ہندوستانی روایات اور عقیدے اب بھی نئے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی طاقت ور اور مضبوط تھے۔ مسلمان اپنے ساتھ اپنا مخصوص مؤثر پیغام لائے تھے۔ اس لئے آسانی سے جذب نہیں ہوئے جس طرح ان سے پہلے آنے والے گھل مل گئے تھے اور وہ ہندوستانی قوم کے بنیادی کردار کو بدل سکے۔

قدیم ہندوؤں کا فلسفہ اور عالمی نقطہ حیرت انگیز طور پر بے تعصب اور رواداری کا تھا۔ پھر بھی ان میں سے بہت سے ذات پات کے فرقے اور اعلیٰ طبقے پیدا ہو گئے۔ مسلمان ایک نئے مسئلے سے دوچار ہوئے وہ یہ کہ دوسروں کے ساتھ مساوات کا اصول کس طرح برتا جائے۔ دوسرے ملکوں میں جہاں مسلمان گئے تھے۔ ان کو اتنی عظیم الشان کامیابی نصیب ہوئی کہ وہاں در اصل سوال ہی نہیں اُٹھا۔ عیسائی مذہب سے ان کا تصادم ہوا اور صدہا سال تک یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں آہستہ آہستہ امتزاج پیدا ہوا مگر اس کی تکمیل سے قبل دوسرے اثرات نے کام کرنا شروع کر دئے اس کے باوجود مغرب کے نئے لبرل خیالات اور صنعتی طریقے کے اثرات ہندوستان کی زندگی اور ذہن پر پڑنے شروع ہو گئے۔ ایک نئے قسم کی قومیت وجود میں آئی جو ناگزیر طور پر نوآبادیات کے خلاف بھی اور آزادی چاہتی تھی جو نئی صنعتی تہذیب زبان ادب اور مغربی طرزِ زندگی سے روز بروز زیادہ متاثر ہو رہی تھی۔

راجہ رام موہن رائے نے قدیم ہندوستان اور جدید رجحانات میں کسی قسم کا امتزاج کرنے کی کوشش کی۔ وویکانند نے قدیم ہندوستانی فلسفہ کے جاندار نظریوں کو جدید لباس سے آراستہ کیا۔ سیاسی اور تہذیبی تحریکیں شروع ہوئیں۔ جن کی تکمیل گاندھی جی اور رابندر ناتھ ٹیگور کی شخصیتوں میں ہوئی۔

یورپ میں سائنسی اور روایتی تہذیب کے درمیان کش مکش ہو چکی تھی اور عیسائیت کا علم کائنات سائنسی نظریوں سے تطابق پیدا نہ کر سکا تھا۔ سائنس نے ہندوستان میں کسی قسم کی کش مکش پیدا نہیں کی اور ہندوستانی فلسفہ آسانی کے ساتھ اپنے بنیادی تصورات کو نقصان پہنچائے بغیر اس کو قبول کر سکتا تھا۔

چار بڑے مذاہب نے ہندوستان کو متاثر کیا ہے۔ دو خود اسی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ ہندومت اور بودھ مت۔ اور دو باہر سے آئے۔ لیکن ہندوستان میں انہوں نے مضبوطی سے اپنے قدم جمائے یعنی عیسائیت اور اسلام۔ سائینس آج مذہب کے پرانے تصور کو چیلنج کر رہی ہے لیکن اگر مذہب اپنے آپ کو عقائد اور رسم و رواج تک محدود نہ رکھیں بلکہ ان کا واسطہ زندگی کے اعلے وسائل سے ہو تو نہ مذہب کا سائنس سے اختلاف ہوگا اور نہ آپس میں جھگڑا۔ ممکن ہے ہندوستان کو یہ عزت حاصل ہو کہ اس طرح کا امتزاج پیدا کرے۔ یہ ہندوستان کی اس قدیم روایت کے مطابق

ہوگا جو اشوک کے فرمانوں میں درج ہے۔

ہر قوم میں اندرونی کش مکش بھی ہوتی ہے۔ مگر اس میں فرق ہوتا ہے۔ جیسے ایک جمہوری ملک میں جہاں بالغوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہے۔ یہ کش مکش عام اور معلوم قانونی طریقوں سے حل کی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان میں ہمیں انتہائی تشویش ناک صوبجاتی اور زبان کی کش مکش سے سابقہ تھا۔ اب جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کا سبب طبقاتی کش مکش ہے اور ایسے لوگوں کو آسانی سے ہٹایا نہیں جا سکتا جن کا وسائل پر قبضہ ہے۔ پھر بھی ہم نے دیکھا ہے۔ کہ ہندوستان میں پرانے راجے، مہاراجے، بڑے جاگیردار، تعلقدار اور زمیندار جیسے طاقت ور لوگ پر امن طریقوں سے بے دخل کر دئے گئے۔ اگرچہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک مستحکم نظام جس کی بنیاد مخصوص لوگوں کے مفاد پر تھی، توڑ دیا جائے۔ اس لئے اگر ہم تسلیم کریں کہ طبقاتی کش مکش موجود ہے تو دوسری طرف یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ جن مسائل کو حل کرنا ہو انہیں پُر امن طریقوں سے حل کرنا چاہیئے۔

زبانیں

(لوک سبھا میں ۷ اگست ۱۹۵۹ء کو کی گئی تقریر سے اقتباس)

مجھے اپنی زبانوں کے بیچ جھگڑے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی لازمی طور سے زبانیں ایک دوسرے سے آگے بڑھتی ہیں مگر اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس سے ایک دوسرے پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ جہاں تک زبانوں کا سوال ہے ہمیں نزاع اور جھگڑے کا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیئے۔

زبانوں کے سلسلے میں ہندوستان میں جو اہم تبدیلی آگئی ہے وہ یہ ہے کہ اسکولوں میں ذریعہ تعلیم ریاستوں کی زبان بن گئی ہے۔ تعلیم میں بلاشبہ انگریزی استعمال کی جاتی ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ خاص طور سے یونیورسٹی تعلیم کے لئے لیکن اسکولوں میں علاقائی زبان کا ذریعہ تعلیم بن جانا لسانی طور سے ماضی سے بہت بڑا انحراف ہے۔

بلاشبہ اس میں بعض خطرات ہیں اور اس کا ڈر ہے کہ یہ علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت پہنچائیں۔ ہمیں ایسے رجحان سے لڑنا ہوگا لیکن اس لڑائی میں ہم لوگوں کو علاقائی زبانوں کی ترقی کی راہ میں نہیں آنا چاہیئے۔ ہمیں بھرپور ترقی کے لئے ان کی ہمت افزائی

کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ایسی ہی ترقی کے ذریعہ زبانیں ایک دوسرے کے نزدیک اور قریب آئیں گی۔ اس طرح نہیں کہ ایک زبان دوسری کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کرے۔

زبانوں سے علیحدگی پسندی پیدا ہونے کے خطرے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم صحیح قسم کے رجحانات کی ہمت افزائی کریں اور اگر ایک زبان کا گروپ دوسرے گروپوں پر مسلّط ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ہندی کی مثال لیجیے جنوب میں فی الحال ہندی پر بہت سے لوگوں کو اعتراض ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان میں یہ احساس ہے کہ یہ زبان ان پر مسلّط کی جا رہی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ ہندی کے خلاف ہیں۔ جنوب میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو ہندی سیکھ رہے ہیں اور اچھی طرح سے سیکھ رہے ہیں۔ ہندی وہاں ترقی کر رہی ہے لیکن جس لمحے آپ ان پر یہ زبان کسی شکل میں عائد کرنے کی باتیں کرتے ہیں تو وہ بگڑ جاتے ہیں اور ان کا بگڑنا بالکل بجا ہے۔ اس لئے زبان کو مسلّط کرنے کی باتوں کو ختم کر دینا چاہیے بلکہ میں اس سے آگے جا کر جنوبی ہند کے لوگوں سے یہ بھی کہوں گا کہ اگر وہ ہندی نہیں سیکھنا چاہتے تو وہ ہندی نہ سیکھیں۔ لہذا اگر ان کی یہ خواہش ہے تو ہمیں ایسا رویہ اپنانا چاہیے۔ اس طرح آپ انہیں نزدیک لے آئیں گے۔

ہمارے دستور میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ ہندی کو بتدریج

ترقی دی جائے۔ ہم نے یہ فیصلہ اس وجہ سے نہیں کیا تھا کہ ہندی
کسی دوسری زبان کے مقابلے میں کوئی بہتر یا طاقت ور زبان
ہے بلکہ اس فیصلے کے پیچھے بعض خاص عملی وجہیں تھیں۔
میں دو باتوں کا مشورہ دوں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ
زبان کو بالکل مسلط نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ایک غیر معین مدّت
کے لئے انگریزی ایک معاون یا مزید زبان کی حیثیت سے سرکاری
مقاصد کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ غیر ہندی
داں علاقے کے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ چوں کہ وہ ہندی زبان
میں مراسلت کے لئے مجبور ہیں اس لئے بعض فوائد سے محروم ہیں
وہ انگریزی میں مراسلت کر سکتے ہیں۔ میں انگریزی کو ایک متبادل
زبان کی حیثیت سے اس وقت تک باقی رکھوں گا جب تک کہ
لوگ چاہیں گے اور میں اس کا فیصلہ ہندی داں لوگوں پر نہیں
چھوڑوں گا بلکہ اس کا انحصار غیر ہندی داں لوگوں پر ہو گا۔
میں انگریزی کے ساتھ جانب داری برت رہا ہوں۔ کیونکہ
انگریزی زبان بڑی اہم ہے۔ اور جدید دنیا سے اپنا واسطہ قائم
رکھنے کے لئے ایک اچھا ذریعہ ہے۔ ہمیں اس ذریعے کو ختم نہیں
کرنا چاہیئے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہمارا مستقبل خطرے میں پڑ
جائے گا۔ یہ بات ناگزیر ہے کہ ہم اپنی ترقی کے موجودہ مرحلے میں
جب کہ ہم پنج سالہ پلانوں پر عمل کر رہے ہیں، ملک میں صنعتیں اور

اور مشینیں لگا رہے ہیں، سائینسی ترقی و تحقیق میں مصروف ہیں تو ہم اگر ساری ہندوستانی زبانوں کو یکجا بھی کر دیں تو ترقی نہیں کر سکتے۔ اگر ہم غیر ملکی زبانوں کو چھوڑ کر ان زبانوں سے چمٹے رہیں گے تو ہم آگے نہیں جا سکتے۔ میں یہ بات آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔

اس ملک کے عوام کی طرف بھی میرا رویہ جانبداری کا ہے میں یہ نہیں بھول سکتا کہ ہمیں اپنے ساتھ ۴۰ کروڑ انسانوں کو لے کر چلنا ہے اور ہم انہیں عملی، نفسیاتی اور جذباتی طور پر ساتھ لے کر نہیں چل سکتے جب تک کہ ان سے ان کی اپنی زبانوں کے واسطے سے رابطہ قائم نہ ہو، یہ بھول جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ یہ انگریزی نہ جاننے والے لوگ ہی ملک کی قسمت کا فیصلہ کریں گے، کیونکہ وہی اس ملک میں بہت بڑی اکثریت میں ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی زبانوں کی ہمت افزائی کرنی ہوگی۔ ہمیں اپنی تعلیم اور اپنا کام رفتہ رفتہ اپنی زبانوں میں کرنا ہوگا تاکہ لوگوں سے رابطہ قائم رہے اور عوام بھی اس جذباتی اتصال کو محسوس کر سکیں کہ ملک اور حکومت میں کیا ہو رہا ہے۔

یہ بے حد اہم بات ہے کہ لوگوں کے خیالات بنیاد سے پروان چڑھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ ہم ایک جدید سائنسی دور میں رہ رہے ہیں۔ اس لئے ہمارے پاس ایک غیر ملکی زبان ہونی چاہیئے جو اس جدید زمانے میں ہمارے کام آسکے۔

زبان کا مسئلہ

سرکاری زبان سے متعلق پارلیمنٹ کی بنائی ہوئی کمیٹی کی رپورٹ پر مباحثے کے دوران لوک سبھا میں تقریر۔ ۴ ستمبر ۱۹۵۹ء

سب سے پہلے تو ہمیں جمہوریت اور تعلیم کے ارتقاء کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ یا اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ سیاسی فیصلے کرنے کے میدان میں بہت سے لوگ آرہے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کو کسی غیر ملکی زبان کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے جتنی زیادہ تعداد میں یہ لوگ آئیں گے اتنا ہی یہ صورت حال کو بدل دیں گے۔ خواہ یہ تبدیلی اچھائی کے لئے ہو یا برائی کے لئے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں ان کا تعلق ایک ایسی نسل سے ہے جن کی پرورش و پرداخت دوسرے ڈھنگ سے ہوئی تھی یعنی انگریزی ذریعہ تعلیم تھی۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ عمل ہندوستان میں اس وقت بھی نہیں دہرایا جارہا ہے اور مستقبل میں تو اس کا امکان اور بھی کم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جو نئی دنیا پروان چڑھ رہی ہے وہ سائنس، ٹیکنالوجی اور صنعت کی دنیا ہوگی۔ یہ اس صنعتی انقلاب کی عکاس ہے جو ہندوستان میں ۲۰ ویں صدی کے وسط میں آرہا ہے۔ یہ ہماری زندگیوں اور ہمارے طرزِ فکر کے تانے بانے کو

بدل رہا ہے۔ اس کی وجہ سے ایسے بے شمار لفظ آرہے ہیں۔ جنہیں ہمیں نئے پیشوں میں استعمال کرنا ہے اور ڈاکٹر رگھو ویر اور سیٹھ گووند داس کی تمام کوششیں اس صورت حال کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان، کلاس روم یا مترجم کے کمرے میں نہیں بنتی۔ یہ اُن لوگوں سے بنتی ہے جو ان میدانوں میں کام کر رہے ہیں۔

آج کی بنیادی حقیقتوں میں ایک حقیقت یہ ہے کہ اسکولوں کا ذریعہ تعلیم اس علاقے کی زبان بن گئی ہے خواہ تامل ہو یا تیلگو، یا مراٹھی یا گجراتی یا کوئی اور۔ اس کی وجہ سے ایک ایسی نسل تیار ہو گی جو اس نسل سے بالکل مختلف ہو گی جس سے ہم لوگوں کا تعلق ہے۔ یہ انگریزی کے مقابلے پر ہندی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ چودہ زبانوں کے ذریعہ (اور اگر آپ چاہیں تو چودہ زبانوں سے بھی زیادہ زبانیں کہہ سکتے ہیں، چاہے دستور میں ان کا ذکر نہ بھی کیا گیا ہو) تعلیم دینے کا سوال ہے۔ اس لئے انگریزی لازمی طور سے ہندوستان میں ایک ثانوی زبان بن جاتی ہے۔ یہ اب ملک کی اولین زبان نہیں رہی۔ یہ پہلی بنیادی حقیقت ہے جسے یاد رکھنا چاہیئے۔ دوسری بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کسی ایک مشترکہ زبان کی ضرورت ہے جس سے ہمارا آپس میں تعلق قائم رہے اور دستور میں طے کر دیا گیا ہے کہ ہندی ہی مشترک سرکاری زبان ہو گی۔ یاد رکھیئے کہ یہ ریاستوں کے درمیان سرکاری مراسلت کے لئے ہے۔ اس لئے انگریزی کو ہندوستان کی اس قسم کی سرکاری زبان بنانے

کی دلیل بہت کمزور پڑ جاتی ہے اگر آپ پہلی حقیقت کو محسوس کریں
میں یہ نہیں کہتا کہ ہندی کسی بھی طرح کسی دوسری زبان
سے بہتر ہے۔ درحقیقت بعض ہندوستانی زبانیں اپنے مواد کے
لحاظ سے زیادہ مالدار اور ہندی سے زیادہ بہتر ادب کی مالک ہیں
میرا خیال ہے کہ ہندی کی اصل بنیادی مخالفت اس ڈر
سے پیدا ہوتی ہے کہ ہندی کے نفاذ سے غیر ہندی وال علاقے کے
لوگوں کو بعض قسم کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بلاشبہ انہیں
دقت ہوگی۔ ہمیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ کوئی شخص اسے دو ہفتے یا
ایک مہینہ یا ایک سال میں سیکھ سکتا ہے۔ یہ دقت ایک لمبی مدت
تک رہے گی۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں ایک ایسا ضابطہ بنا دینا چاہیئے
جس کے ذریعہ ہم کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے غیر ہندی علاقے
کے لوگوں کو ملازمتوں یا دوسری باتوں میں کسی قسم کی کوئی دقت
پیش آئے۔ میرے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ مستقبل
قریب میں ملازمتوں کے لئے ہندی کا جاننا بالکل لازمی نہ ہو۔ حتیٰ
کہ اگر کوئی شخص ہندی کا ایک لفظ بھی نہ جانے تو اسے ملازمت میں
آنے کے قابل ہونا چاہیئے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ دقت کے اس
احساس اور پریشانی کو ختم ہونا چاہیئے۔ لیکن میں انہیں ہندی
سیکھنے کو ضرور کہوں گا۔ مان لیجئے کل ہند سروس کا ایک افسر
مدراس میں کام کرنے جاتا ہے۔ میں اس بات پر زور دوں گا کہ تامل

میں اس کا لازمی ٹیسٹ لیا جائے۔ کل ہند سروس کے افراد کو اس جگہ کی زبان جاننی چاہیئے جہاں وہ کام کرنے جائیں۔ آپ کو یہ بات جبر یا تشدد کی نظر سے نہیں دیکھنی چاہیئے۔ میں کسی ریاست پر ایک ایسی زبان ان معنوں میں مسلط نہیں کرنا چاہتا کہ اس ریاست کو یہ خیال گزرے کہ یہ زبان اس پر مسلط کر دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اگر مدراس کی ریاست یہ کہتی ہے کہ ہمیں لازمی طور پر ہندی نہیں چاہیئے تو ہمیں ان کے اسکولوں میں ہندی کو لازمی نہیں کرنا چاہیئے۔ میں زور زبردستی کے احساس کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس خیال کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ باتیں رضاکارانہ طور سے اور باہمی اشتراک و تعاون کی فضا میں ہوں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً حالات کے پیش نظر اپنے میں مطابقت پیدا کریں۔ ہمیں اپنا رویہ لچکدار رکھنا چاہیئے۔ میں ایسے معاملوں میں تاریخ مقرر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ انگریزی ایک معاون یا مزید زبان ہوگی مختلف ریاستوں کے درمیان سرکاری کاموں کے لئے ہندی بتدریج زیادہ سے زیادہ استعمال ہوگی۔ انگریزی بھی ان کاموں میں استعمال ہوگی۔ کوئی ریاست مرکز سے مراسلت کرنے یا ایک دوسرے سے لکھا پڑھی کرنے میں انگریزی استعمال کر سکتی ہے۔ کوئی بھی شخص یا ریاست اپنے کام انگریزی میں کر سکتی ہے۔ اس کے لئے کوئی

پابندی نہیں ہے۔ہم انہیں اپنے کام ہندی میں کرنیکی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اگر وہ کر سکیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سلسلے میں وقت کا بھی کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے۔ سوائے اس بات کے کہ غیر ہندی داں علاقوں کے لوگ جو اس (ہندی) کے نفاذ سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ اس کے لئے راضی ہو جائیں۔میں اس بات سے پوری طرح متفق ہوں۔

میں اس ایوان سے گزارش کروں گا اور خاص طور سے ہندی کے علاقوں کے ساتھیوں سے کہوں گا کہ اگر کوئی چیز ہے جو ہندی کی ترویج و اشاعت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے تو وہ بعض اوقات ان کا ضرورت سے زیادہ جوش و خروش اور اس معاملے میں ان کا رویّہ ہے جو دوسروں کو برہم کر دیتا ہے اور ایسا ہونا صحیح بھی ہے۔

چھوٹی باتوں سے بچیے

(انجینیرنگ کالج ترو پاتی میں تقریر، اکتوبر ۱۹۵۹ء)

ان پہاڑی سلسلوں میں نظر ڈالیے اور ان سے پیار کیجیے اور انہیں شمال کے عظیم پہاڑ ہمالیہ کا چھوٹا بھائی سمجھیے جو وہاں بڑی سختی اور مضبوطی کے ساتھ لاکھوں برسوں سے ہندوستان کے پاسبان کی حیثیت سے کھڑا ہے۔ ان پہاڑیوں اور ان پہاڑوں کے بیچ ہندوستان کی ساری دھرتی آپ کی ہے۔ آپ آندھرا پردیش کا ایک گیت گاتے یا سنتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے لیکن اگر آپ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں تو اچھا ہے کہ صرف آندھرا پردیش ہی نہیں بلکہ سارا ہندوستان آپ کی میراث ہے۔ آپ اور ہم سب ہندوستان کے بچے ہیں۔ ان کا اس عظیم الشان میراث میں برابر کا حصّہ ہے۔

ان مشکل کاموں کو سوچیے جو ہمیں درپیش ہیں اور ان حرارت اور جوش پیدا کرنے والے مسائل کو دھیان میں لائیے جو آج ہندوستان میں ہمارے سامنے ہیں۔ تمام لوگوں کو یکساں مواقع ملنے چاہیں اور اس کے لئے ہر رکاوٹوں کو چاہے یہ رکاوٹیں ذات کی پیدا کردہ ہوں یا ریاست اور زبان کی راستے میں نہ آنے دینا چاہیئے۔ ہمیں اپنے اس بڑے ملک کو ایک خاندان

سمجھنا چاہیئے جس کے افراد کو آپس میں میل جول اور تعاون سے کام لینا چاہیئے اور ہمیں اس تصور کو عزیز رکھنا چاہیئے کہ پورا خاندان پھولے پھلے اس کے چند افراد نہیں۔ لہٰذا آپ کو اپنے طور سے سوچنا چاہیئے کہ اس عظیم کوشش میں آپ کا کیا حصّہ ہونا چاہیئے اس کے علاوہ یہ بھی اچھی طرح احساس ہونا چاہیئے کہ اس کارِ عظیم میں آپ ایک حصّہ دار ہیں۔

یاد رکھئے کہ اگر آپ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتیں سوچتے رہے اور معمولی معمولی جھگڑوں میں اُلجھے رہے اور زندگی کی چھوٹی موٹی باتوں کے لئے جوش میں آتے رہے تو آپ ہمیشہ چھوٹے بنے رہیں گے لیکن اگر آپ زندگی کی تمام بڑی بڑی باتوں کو سوچیں اور زندگی کے چیلنج کا طاقت اور ہمت سے مقابلہ کریں تو آپ بھی بڑے بن جائیں گے۔ آپ صرف اس حد تک بڑھیں گے' اور ترقی کریں گے جس حد تک ہندوستان بڑھتا اور ترقی کرتا ہے۔ اگر آپ اس حد تک خود غرض ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ آپ دوسروں کے کندھوں پر چڑھ کر اور دوسروں کا خیال نہ کر کے ترقی کر سکتے ہیں تو آپ کی تعلیم بالکل بے کار ہو گی۔ اس لئے اس کارِ عظیم میں اور ہندوستان کی ان زبردست کوششوں میں آپ کو دل و جان سے لگ جانا چاہیئے۔ اس سے آپ کو اپنی ترقی میں مدد ملے گی۔

اندرونی خطرہ

۱۵ راگست ۱۹۶۰ء کو یوم آزادی کے موقع پر تقریر

ایک قوم کا اولین فرض اپنی آزادی کا تحفّظ اور اس کا استحکام ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جس سے تمام دوسری سرگرمیوں کو ناپا جائے گا۔ اگر ہم دوسری چیزوں، جیسے اپنے گروہ، اپنی ریاست اپنی زبان یا اپنی ذات کو زیادہ اہمیت دے دیں اور اپنے ملک کو بھول جائیں تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ان تمام چیزوں کا اپنا ایک مناسب مقام ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی ریاست، اپنی زبان، اپنے گروپ کو ملک سے بالاتر سمجھیں تو قوم تباہ و برباد ہو جائے گی۔

میں یہ بات آپ سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس یاددہانی کا وقت آگیا ہے کہ ہم گزشتہ نصف صدی میں کی جانے والی کوششوں اور قربانیوں کو بھول نہ جائیں۔ گاندھی جی نے ہماری قوم کی تعمیر کی۔ اسے مضبوط بنا دیا اور سوراج حاصل کرنے کے لئے اہنسا کا ہتھیار دیا۔ سوراج اس لئے ملا کہ قوم میں اتحاد اور طاقت تھی۔ اگر ہم صحیح طریقے اور مل جل کر کام کریں تو مستقبل کے لئے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ باہر سے کوئی خطرہ

نہیں ہے۔ بلکہ خطرہ ہماری اپنی کمزوریوں، باہمی تباہی لانے والے جھگڑوں اور معمولی معمولی باتوں کے لئے اُلجھنے میں ہے۔

سینکڑوں برس پہلے ہمارا ملک ایسے جھگڑوں کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا اور باہر سے لوگ آئے اور انہوں نے اسے فتح کر لیا۔ وہی علامتیں پھر بعض جگہوں پر دوبارہ اُبھرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ لوگ اپنا ملک اور اس کی ایکتا کو بھول جاتے ہیں اور زبانوں کے سوال پر لڑتے ہیں۔ ایسا وقت آ گیا ہے جب ہر ہندوستانی کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے۔

مستقبل کے مؤرخ کیا کہیں گے۔ وہ لکھیں گے ہندوستان نے ایک عظیم رہنما گاندھی جی کو پیدا کیا اور انہوں نے لوگوں کو ان دیواروں کو توڑ دینے کا سبق سکھایا جو انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہری جنوں کی حالت بہتر بنائی جائے کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ ہر شخص کو بلا تفریق مذہب و ملت و ذات یکساں حقوق حاصل ہوں اور وہ آزاد ہوں۔ ہندوستان کا ہر فرد ہمالیہ سے لے کر کنیا کماری تک بیک آواز اٹھ کھڑا ہوا اور عظیم گاندھی کی قیادت میں اپنی پیٹھ کا کچھ بوجھ اُتار پھینکا، آگے بڑھا اور آزادی حاصل کی صدیوں کے بعد افق پر ہندوستان کا ستارہ اُبھرا۔ دنیا کی مجلسوں میں اس کی آواز سنی گئی کیونکہ یہ ہندوستان کی صحیح اور سچی آواز تھی پھر ہندوستان کے یہی لوگ جنہوں نے عزم و ہمّت کا مظاہرہ کیا تھا

خواب غفلت میں پڑ گئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ بعض اوقات وہ مذہب کے نام پر جھگڑے اور بعض اوقات ذات یا زبان کے مسئلے پر لڑے۔

آپ نے دیکھا کہ آسام میں بڑا ہی افسوس ناک اور پریشان کن سانحہ ہوا۔ اس کی وجہ سے آسام اور بنگال کی ریاستوں میں دکھ اور پریشانیاں پیدا ہوئیں۔ پنجاب میں جو نزدیک ہی ہے زبان کے نام پر عجیب وغریب باتیں ہو رہی ہیں۔ ہندی اور پنجابی، بنگالی اور آسامی کے درمیان جو جھگڑے ہو رہے ہیں وہ میری سمجھ میں نہیں آتے۔

ہمیں غلط سمتوں میں نہیں بھٹکنا چاہیئے۔ ہم اپنے ملک کو تباہ ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہمیں اپنی آزادی کے انمول خزانے کو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اپنے ہاتھوں سے کھونا نہیں چاہیئے۔ یہ سوال چند سرکاری افسروں، وزیروں یا وزیر اعظم کے لئے نہیں ہے۔ اس کی ضمانت ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو دینی ہوگی۔

۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

ایک اپیل

ہم میں سے ہر ایک کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ ہندوستان اور اس کے عوام کے مستقبل کا انحصار صرف رواداری، تعاون اور اشتراک پر ہے جو زمانۂ دراز سے ہمارے کلچر کی بنیاد رہا ہے۔

ہم نے دستور میں طے کر دیا ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ریاست ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں کوئی مذہب ہی نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مذاہب کو یکساں عزت حاصل ہوگی اور تمام لوگوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں گے خواہ ان کا مذہب کچھ بھی ہو۔ اس لئے ہمیں اپنے کلچر کے اس پہلو کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیئے جو کہ آج کے ہندوستان میں بھی اہم ترین ہے۔ جو لوگ ایک ہندوستانی اور دوسرے ہندوستانی کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں اور جو انتشار پسند طاقتوں کو آگے بڑھاتے ہیں وہ ہندوستان یا اس کے کلچر کی کوئی خدمت نہیں کرتے وہ ہمیں اپنے ملک میں کمزور کرتے ہیں اور باہر کے ملکوں میں بدنام۔ اس لئے یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ ہم ہندوستان کی جذباتی ہم آہنگی کے لئے کام کریں۔

یہ بات لسانی اختلافات پر صادق آتی ہے۔ یہ ہمارے لئے فخر کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں عظیم زبانیں ہیں جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ ہمیں سب زبانوں کی خدمت کرنی چاہیئے اور اس زبان کو جو ہماری

مادری زبان نہیں ہے غیر ملکی نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ تمام زبانیں ایک زمانے سے پھل پھول رہی ہیں اور ہندوستان ہی کا گوشت پوست ہیں اگر کسی کو کوئی زخم لگ جائے تو گویا ہندوستان کو زخم لگتا ہے۔

اس لئے میں اپیل کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے عوام کی جذباتی ہم آہنگی کے لئے شعوری طور سے کوشش کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات خواہ ہماری حیثیت سرکاری ہو یا غیر سرکاری، روزمرہ زندگی کا معمول بن جائے تاکہ ہم اپنے خوابوں کا ہندوستان تعمیر کر سکیں۔

ایک بڑا مذہب

(۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کو یوم آزادی کے موقع پر کی گئی تقریر سے اقتباس)

کوئی مرد یا عورت اگر کوئی ایسا کام کرے جس سے ہماری ایکتا کو نقصان پہنچے اور وہ کمزور ہو تو یہ ہندوستان کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہوگا۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی اگر ہم اس بات کو بھول جائیں اور صوبہ پرستی، فرقہ پرستی اور ذات پات کے تعصبات کے شکار ہو جائیں اور زبان کے سوال پر جھگڑیں۔ کوئی ایسی چیز جو ہمارے درمیان پھوٹ پیدا کرتی ہے تو وہ خراب ہے۔ یہ ہماری شاندار ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے جس پر ہم گامزن ہیں۔

ہمیں ایک مضبوط اور بہادر قوم کی ضرورت ہے جس میں سب لوگ متحد ہو کر رہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ بہن بھائیوں کا سا برتاؤ کریں۔

سب سے اہم کام تو یہ ہے کہ ہم دل و دماغ کا اتحاد پیدا کریں۔ ایک ایسی روحانی ایکتا جو قوم میں ایک نئی روح پھونک دے۔ دراصل ہمیں جذباتی یک جہتی کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم مادی ترقی حاصل کر لیں۔ لیکن یہ ترقی بے معنی ہوگی اگر ہم مل جل کر رہنا اور کام

کرنا نہیں سیکھیں گے۔

ہمارا سماج ہندوستانی سماج ہے جس میں سب لوگ شامل ہیں ہندوستان میں بہت سے مذاہب ہیں۔ ہندوستان کا ہر مذہب ہمارے احترام کا مستحق ہے ہزاروں برسوں سے ہماری یہ روایت رہی ہے۔ ہمیں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے ایک بڑا مذہب بھی ہے۔ اور وہ ہے ہندوستان کا مذہب۔ اس مذہب کو مانتے ہوئے ہمیں اکٹھے رہنا اور آگے بڑھنا ہے۔

جب کبھی آپ کوئی کام کرنا چاہیں تو اس کا اندازہ لگانے کے لئے میں ایک پیمانہ تجویز کر دوں گا۔ اپنے آپ سے پوچھئے کیا یہ مختلف چیزوں کو قریب لاتا ہے یا انہیں علیحدہ کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا پیمانہ ہے جس سے آپ کو اپنے کاموں کو ناپنا ہے۔ اگر آپ کا کام لوگوں کو نزدیک لاتا ہے تو بہت مفید ہے اور اگر یہ لوگوں میں پھوٹ ڈالتا ہے تو خراب ہے۔ ہندوستان میں ڈسپلن اور اتحاد سب سے پہلے ہونا چاہیئے محض قدم ملا کے چلنے کی ڈسپلن نہیں بلکہ دل و دماغ کا نظم و ضبط اور ان کا اتحاد۔

قومی یک جہتی

قومی یک جہتی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کی گئی تقریر، نئی دہلی ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء

میں ہندوستان کو کسی خوف یا آنے والے خطرے کے احساس کی نظر سے نہیں دیکھتا ہوں۔ میں قومی یک جہتی کے سوال کو سب کے لئے ایک چیلنج سمجھتا ہوں، کیوں کہ ہم ہندوستان میں اپنی لمبی تاریخ میں ایک انقلابی دور سے گزر رہے ہیں۔ اس میں تعجب کی بات نہیں کہ تغیر کے اس دور میں چند ایسی باتیں ظہور پذیر ہوئیں جو ہمیں پسند نہیں ہیں۔ ہم اس عظیم دور سے ایسے نہیں گزر سکتے کہ ہمیں خطروں کا مقابلہ نہ کرنا پڑے یا کبھی ٹھوکر نہ لگے۔

ہمیں چند مشکلات ماضی سے ورثہ میں ملی ہیں۔ مگر دوسری ایسی ہیں جو ہماری ہونے والی ترقی کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوئی ہیں۔ اس لئے میں ان سے بد دل نہیں ہوں جس طرح یہ رونما ہو رہی ہیں وہ در حقیقت اس بات کی علامت ہیں کہ ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور ان برائیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں جو ہماری راہ میں حائل ہیں۔

یہ برائیاں کیا ہیں، ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ موٹے طور پر وہ صوبہ پرستی، ذات پات کا بھید بھاؤ، مذہب اور زبان پرستی کے مسئلے ہیں۔ یا ہم

یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ مختلف باتیں ہیں جو کہ ہمیں تنگ نظر بناتی ہیں۔ کسی بھی وقت تنگ نظر ہونا بُرا ہے لیکن اس وقت جبکہ تمام دنیا میں متحد رہنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ تنگ نظر ہونا انتہائی مضر ہے۔ ظاہر ہے کہ بہت حد تک یہ باتیں ہمارے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ جب ہم ہندوستان کو معاشی سماجی اور دوسرے طریقوں سے بدلنا چاہتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کو جنہوں نے اپنی رائیں بھیجی ہیں اور قومی یک جہتی کے سلسلے کی بعض کمیٹیوں نے جن کی نشستیں ہو چکی ہیں، اس بات پر زور دیا کہ ہماری سماجی اور معاشی ترقی ہی ان تمام برائیوں کا علاج ہے، بنیادی طور پر یہ درست ہے کہ یہ ان ہی امراض کی علامتیں ہیں جن کے ہم شکار ہیں یعنی معاشی اور سماجی پستی۔ جتنا ہم اس پستی کو دور کریں گے، اتنا ہی ان امراض پر قابو پائیں گے۔

قومی یک جہتی کا مسئلہ ایک معنوں میں زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے مگر سب سے زیادہ یہ تعلیم پر اثر انداز ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو بچپن سے ہی تربیت دی جائے۔ یہ بنیادی بات ہے۔

کئی وجہوں سے یہ ایک بے مثال اجتماع ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ مختلف پارٹیوں اور مختلف فکر و خیال کے نمائندے اس میں شریک ہوئے بلکہ زیادہ اس وجہ سے کہ ہمارے سامنے جو مسائل ہیں۔ ان کے متعلق سبھوں کا رویہ ایک جیسا ہے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح اختلافات کے باوجود ہم مشترک مقصد کے لئے مل کر کام کر سکتے ہیں۔

خاص طور سے اس بات میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ سیاسی یا کسی طرح سے ہندوستانی جمہوریہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ جو غلط رجحانات ہمیں نظر آتے ہیں وہ کسی طرح نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اپنی ناکامیوں، کمزوریوں اور مشکلوں کے باوجود ہندوستان ایک مستحکم ملک ہے جو برابر آگے بڑھ رہا ہے جس کا مقابلہ کسی دوسرے ملک سے بڑی اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے سامنے جو مسئلے ہیں وہ بڑے سخت اور کٹھن مسئلے ہیں۔ مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ لوگوں میں ان کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ انہیں ایک دم نہیں بلکہ رفتہ رفتہ حل کر لیں گے۔ اس کے لئے ایک ذہنی مزاج کی ضرورت ہے۔ ان اہم مسائل کو منطقی طور سے مناسب ڈھنگ سے یا پر اعتقاد ہو کر حل کرنا ہے کس پر بھروسہ کیا جائے؟ اپنے آپ پر، اپنے لوگوں پر، اور مل جل کر کام کرنے کی اپنی صلاحیت پر اور ساتھ مل کر بڑے بڑے مسئلوں کو حل کرنے پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اس لئے یہ کانفرنس لازمی طور پر ہم سب کے لئے یقین و اعتماد کا درجہ رکھتی ہے جو فیصلے ہم نے کئے ہیں ان کے پس پردہ اسی اعتقاد کا اظہار ہے جو ہندوستان پر ہے۔ اس کے عوام پر ہے اور خود اپنے آپ پر ہے۔

ہماری نئی یاترا

(۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو مدورائے میں کی گئی تقریر سے اقتباس)

ہم یہاں ملک کے دُور دراز حصوں سے اپنے ملک کے بارے میں ایک دوسرے سے صلاح و مشورہ کرنے اور اس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم مدورائے کے تیرتھ استھان میں اپنی تیرتھ یاترا پر آئے ہیں۔ اس نئی یاترا کا تعلق ان ہزاروں لاکھوں لوگوں کے مستقبل سے ہے جو ہمارے اس مہان دیش میں رہتے ہیں۔

ہندوستان صدیوں سے تیرتھ استھانوں کا ملک رہا ہے۔ سارے ملک میں آپ کو پرانی متبرک جگہیں ملیں گی۔ ہمالیہ کی برف پوش بلندیوں میں بدری ناتھ اور کدار ناتھ سے لے کر دکن میں کنیا کماری تک ایسی جگہیں ملیں گی اور زمانہ دراز سے لوگ اتر سے دکھن اور دکھن سے اتر تیرتھ یاترا کے لئے جاتے اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے ہیں کیونکہ ان کا تعلق اس مہان دیش سے تھا۔

وہ کون سی کشش تھی جس نے ہمارے عوام کو اتر سے دکھن اور دکھن سے اتر تیرتھ یاترا کے لئے کھینچ کر لے گئی۔ وہ کون سا مشترک خیال تھا جس کی وجہ سے انہوں نے ملک کے ایک علاقے سے دوسرے

علاقے کا سفر کیا۔ وہ جذبہ یہ تھا کہ ہمارا ملک ایک ہے، ہماری تہذیب ایک ہے اور اسی جذبے نے ہمیں باندھے رکھا۔ ایک مشترک جذبہ اور ایک مشترک خیال ہم میں سینکڑوں اور ہو سکتا ہے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوا۔ ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ بھارت کا دیش وہ ملک ہے جو اتر میں ہمالیہ سے لے کر دکھنی سمندروں تک پھیلا ہوا ہے ایک عظیم ملک کی حیثیت سے بھارت کا یہ تصور جسے لوگ مقدس ملک سمجھتے ہیں۔ صدیوں سے موجود رہا ہے اور ہمیں ایک رشتے میں باندھے رہا ہے، حالانکہ اس ملک میں مختلف سلطنتیں قائم ہوئیں اور چاہے ہم مختلف زبانیں بولتے رہے ہوں۔ یہ ریشمی دھاگا اب بھی ہمیں کئی طریقوں سے باندھے ہوئے ہے۔

ان ہزاروں برسوں میں یہ ملک ہمارے دماغوں میں، ہمارے دلوں میں اور ہماری روحانی میراث میں ہمارا رہا ہے۔ میں جو کہ اتر سے آیا ہوں یہاں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا کیونکہ یہ جگہ میرے ملک کا ہی ایک حصہ ہے اور میں اپنے دوستوں، اپنے ساتھیوں اور ایسے لوگوں کے درمیان ہوں جن کے بھی وہی خیالات، تصورات اور جذبات ہیں جو میرے ہیں۔ اسی طرح ملک کا اتری حصہ صرف ان لوگوں کا نہیں ہے جو وہاں رہتے ہیں بلکہ یہ آپ کا بھی ہے۔ حالانکہ آپ ملک کے جنوبی حصے میں ہیں۔ ہمالیہ آپ کا بھی اتنا ہی ہے جتنا میرا ہے۔ جس طرح کنیا کماری اور مدورائے پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا ہے۔ یہ ملک ہماری مشترکہ میراث ہے جہاں ہم پیدا ہوئے ہیں اور جس کی ہم خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

صدیوں سے جغرافیہ نے ہمیں ایک عظیم الشان ملک اور تاریخ اور ہماری مشترک تہذیب نے ہمیں ایک ملک بنائے رکھا ہے۔ ہماری مشترکہ امید، ڈر اور خوف اور جیت اور ہار نے ہمیں ایک بنا دیا ہے یہ ماضی کی باتیں تھیں۔ موجودہ زمانے میں ہم نے اپنی مشترکہ محنت و مشقت، مشترکہ قربانیوں اور مشترکہ جدوجہد کے ذریعے ہندوستان کی آزادی حاصل کی۔

آج جبکہ ہم کم سے کم سیاسی طور سے مُتحد ہیں اور ایک آزاد ملک میں کس طرح اس بات کی اجازت دے سکتے ہیں کہ اس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جائے جو ہم نے ورثے میں پایا ہے اور اس آزادی میں خلل پیدا ہو جائے جس کے حصول کے لئے ہم نے جدوجہد کی تھی۔ ماضی اور حال نے ہمیں ایک مشترک میدان مہیّا کیا ہے، اس لئے ہمارا مستقبل بھی مشترک ہونا چاہیئے۔ وہ مستقبل جس کے حصول میں ہم لگے ہوئے ہیں، وہ مستقبل جو ہمارے ملک کے لاکھوں آدمیوں اور ان کی بھلائی کا مستقبل ہے۔ چاہے ہم جس علاقے میں رہتے ہوں۔ اس کے لئے مقصد کے اتحاد، مشترکہ کوششوں اور قربانیوں کی ضرورت ہے۔

ہندوستان میں بہت سی ریاستیں ہیں لیکن یہ تقسیم کسی اختلاف کی مظہر نہیں، بلکہ ایک مشترکہ مقصد میں معین اور مددگار ہونے کے لئے انتظامی لحاظ سے کی گئی ہے۔ ان ریاستوں کی وجہ سے ہمیں الگ الگ نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ہندوستان میں جو بہت سی

زبانیں ہیں۔ انہیں بھی تفرقے کا باعث نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ کے یہاں تامل زبان بولی جاتی ہے جو سنسکرت ہی کی طرح ایک قدیم زبان ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ زبان پھلے پھولے اور ترقی کرے۔ بلاشبہ شمال کے لوگوں کو جنوب کی زیادہ سے زیادہ زبانیں جاننی چاہئیں۔ کسی زبان کو دلوں کو الگ کرنے کا ذریعہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے ہمیں ایک دوسرے کے قریب لانا چاہیئے اور ہندوستان کی ہر زبان آپس کے رابطے اور خیالات کے لین دین کے ذریعے دوسری زبان کو ترقی کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔ زبانیں دلوں کو ملاتی ہیں الگ الگ نہیں کرتیں۔ اس طرح ہندوستان بہت سے مذہبوں والا ملک ہے اور ماضی میں مذہب تفرقہ پیدا کرنے والا عنصر نہیں تو آج پھر یہ ایسا کیوں ہونے لگا۔

گزشتہ چند برسوں میں دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اور آج ساری دنیا ایکتا اور اتحاد کی تلاش میں ہے عالمی حکومت یا ایک عالمی وفاق کا تصوّر اس اتحاد کے جذبے کا مظہر ہے کیونکہ آج دنیا سمٹ گئی ہے۔ آپ ہوائی جہاز کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر بڑی تیزی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے اس دنیا سے باہر اور اس سے پرے خلاء کا بھی سفر کیا ہے اس لئے آج دنیا پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ اتحاد اور امن کی بھوکی ہے اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک متحد، یک جہت اور سخت محنت کے لئے تیار ہندوستان قیام امن اور دنیا کی بہت سی دوسری اچھی چیزیں جن کے

حصول میں ہم لگے ہوئے ہیں کو پانے میں زبردست مدد دے سکتا ہے۔

جواہرات

جواہر لال نہرو

مذہب، جیسا میں نے اُس پر عمل ہوتے دیکھا اور جیسا کہ اُسے سوچنے
والے دماغوں نے تسلیم کیا، چاہے وہ ہندو مت ہو یا اسلام، یا بودھ مت
یا عیسائیت ہو، مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکا۔ وہ توہماتی مشقوں اور
کٹر خیالات سے قریبی طور سے وابستہ معلوم ہوا۔ اور اُس کی پُشت پر
زندگی کے مسائل تک پہنچنے کا ایسا طریقہ تھا جو، یقیناً سائنس کا راستہ
نہیں!

میں کسی مذہب یا کٹر خیال سے بندھا ہوا نہیں ہوں۔ لیکن اسے
مذہب کہیئے یا کچھ اور، میں انسان کی قدرتی رُوحانیت کو مانتا ہوں۔ میں
فرد کے قدرتی اور پیدائشی وقار میں یقین رکھتا ہوں۔ میں اس بات پر
ایمان رکھتا ہوں کہ ہر فرد کو مساوی موقعہ ملنا چاہیئے۔ میں یقین رکھتا ہوں
ایک آدرش کے طور پر ــــ (اُس تک پہنچنا مشکل ہو سکتا ہے) ــــ

ایک ایسے egalitarian سماج پر جس میں بڑے اختلافات نہ ہوں۔ مجھے رئیسوں کی بے ہودگی اتنی ہی ناپسند ہے جتنی مُفلس کی مُفلسی!

یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان مذہبی ہے، فلسفیانہ ہے، دھیانی گیانی ہے، مابعد الطبیعیاتی ہے، دُنیا سے بے تعلق ہے اور دُور دراز آیندہ کے خوابوں میں کھویا ہوا ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے اور شاید جو ہمیں یہ بتلاتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان خیالوں کے سمندر میں ڈوبا رہے اور فکر کی اُلجھنوں میں پھنسا رہے۔ تاکہ وہ اس دُنیا پر اور اس کی متاع پر قبضہ جما سکیں اور ان کے "مفکروں" کی مزاحمت کے بغیر اپنی مسرتوں میں مگن رہ سکیں۔

ہر مکتبِ خیال و فلسفہ کی نظریں اس (گیتا) کی طرف اُٹھتی ہیں اور وہ اپنے طریقے سے اس کو سمجھتا سمجھاتا ہے۔ بحران کے دِنوں میں، جب انسان کا ذہن شک کی اذیت میں مبتلا ہوتا ہے اور فرائض کی کشمکش سے پارہ پارہ ہوتا ہے تو وہ رہنمائی اور روشنی کے لیے اور بھی گیتا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بحران کی نظم ہے، سیاسی اور سماجی بحران کی۔ اور اس سے بھی زیادہ انسان کی رُوح کے بحران کی۔ ماضی میں گیتا کی بے شمار تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور اب بھی ان کا

نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ تلک، آربندو گھوش، گاندھی۔ جیسے آج کے خیال و عمل کے لیڈروں تک نے اس پر لکھا ہے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی تشریح دی ہے۔ گاندھی جی اپنے عدم تشدّد کے مستحکم یقین کی بُنیاد اس پر رکھتے ہیں، دوسرے صحیح مقصد کے لئے تشدّد اور جنگ کا (اس سے) جواز پیش کرتے ہیں۔

... میں نے کبھی کبھی گیتا کو پڑھا اور سراہا تھا۔ میں نے اسے بار بار پڑھا کسی فلسفیانہ یا مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اس لئے کہ اس کے کئی حصّے ایسے ہیں جنہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس طرح کی بات کہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا اچھا نتیجہ نکلے گا۔ رفتہ رفتہ میں اس خیال کو نشو و نما دے کر اپنی سائنسی فکر کو اس پر لگانے لگا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہر عمل کا، قدرتی طور پر ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر صحیح عمل کا، اس حد تک، صحیح نتیجہ ہونا چاہیئے، چاہے اس کا یقین نہ بھی ہو۔ اور یہ کہ کہیں نہ کہیں، ہر غلط عمل کا غلط نتیجہ ہوگا۔

گیتا کا پیغام فرقے یا ذات پات تک محدود نہیں ہے اور نہ یہ کسی خاص مکتب خیال کے لئے ہے۔

گوتم بدھ کا راستہ، درمیانی راستہ ہے۔ خود پرستی اور نفس کُشی

کے درمیان۔ جسم کو ایذا دینے کے اپنے تجربے کی بنا پر اُنہوں نے
کہا کہ وہ شخص، جس کی قوّت ختم ہو گئی ہو، صحیح راستے پر آگے
نہیں جا سکتا۔ یہ درمیانی راستہ آریائی آٹھ تہوں والا راستہ تھا۔
صحیح یقین، صحیح خواہش، صحیح گفتار، صحیح کردار، صحیح طریقۂ حیات،
صحیح عمل، صحیح فکر، صحیح مسرّت۔

دوسری دُنیا سے مجھے دلچسپی نہیں۔ میرا ذہن ان باتوں سے لبریز
ہے جو مجھے اس دُنیا میں کرنا چاہئیں۔ اور اگر مجھے یہاں اپنا راستہ
صاف نظر آئے تو پھر میں مطمئن ہوں۔ اگر یہاں میرے فرائض مجھ پر
واضح ہیں تو میں خود کو کسی دوسری دُنیا کے لئے پریشان نہیں کرتا۔

زندگی کی نفی، ترکِ لذّات، زندگی کی مسرّتوں اور محسوسات سے
کنارہ کشی ——— یعنی سنیاس مجھے پسند ہے اور نہ مجھے اس سے
دلچسپی ہے۔ میں نے شعوری طور سے کسی ایسی چیز کو ترک نہیں کیا
ہے جس کی میں واقعی قدر کرتا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی اور دُنیا، کسی آیندہ زندگی میں نہیں،
مجھے اس دُنیا اور اسی زندگی سے دلچسپی ہے۔ آیا کوئی رُوح نام
کی چیز ہے یا نہیں۔ یا موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ مجھے نہیں

معلوم۔ اور یہ سوال ہیں تو اہم، لیکن یہ مجھے ذرا بھی پریشان نہیں کرتے جس ماحول میں، میں پلا ہوں، اس میں رُوح (آتما) آیندہ زندگی، سبب اور نتیجہ کا "کرم" مفروضہ اور پیدائش کا چکر "مُسلّمات" سمجھے جاتے ہیں۔ مجھ پر ان کا اثر ہوا۔ اور ایک معقول میں ان معتقدات کی طرف میرا جُھکاؤ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رُوح ہو، جو جسمانی موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور زندگی کے اعمال کا تعین کرنے والا سبب اور نتیجے کا مفروضہ معقول معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ آخری سبب کی بات سوچیے تو اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ رُوح کو فرض کر لیجیے تو "آواگون" کا مفروضہ بھی کچھ منطقی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن میں ان کو یا دوسرے مفروضوں کو مذہبی اعتقاد کے طور پر نہیں مانتا ہوں۔ یہ تو "نامعلوم" کے علاقے میں ایک طرح کی ذہنی سٹہ بازی ہیں۔ ان سے میری زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور بعد میں یہ دُرست ثابت ہوں یا غلط، میرے لئے کوئی فرق نہیں ہوگا۔

میں اس بات پر بالکل مطمئن ہوں کہ اگر ہم صحیح راستے پر رہیں اور کسی فوری فائدے کے لئے خواہ وہ کسیقدر کے نقطۂ نظر سے بھی اس راستے سے نہ ہٹیں تو ہم کامیاب ہوں گے۔ کوئی ملک جو کسی بُنیادی جھوٹ پر اپنا مؤقف تعمیر کرتا ہے، اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔

مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ جب تک ہم اپنے قومی اور بین الاقوامی تعلقات میں اخلاقی قانون کی برتری کو نہیں مانیں گے، ہمیں دائمی امن نہیں ملے گا۔

جب تک ہم صحیح ذریعوں کو نہیں اپنائیں گے، نتیجہ ٹھیک نہیں ہو گا اور اُس سے نئی بُرائیاں پیدا ہوں گی۔

حکومتیں اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتیں جو حقائق معلوم کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ وہ صداقت کی تلاش کو پسند نہیں کرتیں۔

گو صداقت کبھی کبھی دبائی جا سکتی ہے، لیکن یہ ہمیشہ کے لیے دفن نہیں کی جا سکتی۔ باقی رہنے والی فتح کی بنیاد صرف صداقت کی چٹان پر رکھی جا سکتی ہے۔

تشدد کا راستہ خطرناک ہے اور جہاں تشدد ہو، وہاں آزادی زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتی۔

کوئی حکومت تشدد کا پرچار برداشت نہیں کر سکتی

عظیم میراث سے زیادہ اچھی اور سود مند کوئی اور چیز نہیں۔

لیکن ایک قوم کے اپنی میراث پر قانع ہو کر بیٹھ جانے سے زیادہ خطرناک کوئی اور بات نہیں۔ وہ قوم ترقی کر ہی نہیں سکتی جو صرف اپنے اجداد کی نقالی کرتی ہے۔ وہ چیز جو قوم کو بناتی ہے، تخلیقی اور عملی سرگرمی ہے۔

ماضی باقی رہتا ہے ... ماضی مجھے بوجھ کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ مجھے زندگی کی حرارت بھی بخشتا ہے لیکن صرف اُس وقت جب یہ حال کو چھُوتا ہے اور جیتے جاگتے حال کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر ماضی سرد، بنجر، بے جان اور غیر دلچسپ ہوتا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ میرے نزدیک آنے والی کل، آج سے کچھ زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگر ہم ترقی کی بات سوچتے ہیں تو ہمیں آنے والی کل کے لئے کام کرنا ہوگا تاکہ ترقی ممکن ہو سکے۔ اور ہمیں ایک مستحکم بُنیاد پر کام کرنا ہوگا، چاہے یہ بُنیاد ڈالنے میں آج کچھ مشکلیں ہی کیوں نہ پیش آئیں۔

ہم خدا سے انکار کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم انسان سے انکار کریں تو پھر ہمارے لئے کیا اُمید ہے، کیونکہ ہر چیز بے کار ہو جائے گی۔

تشدد، اجارہ داری اور چند ہاتھوں میں دولت کا جمع ہو جانا پیدا وار ہیں موجودہ اقتصادی ڈھانچے کی۔ بڑی صنعتوں کی وجہ نہیں۔ سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں کے ہاتھوں بڑی صنعتوں کے بے جا استعمال سے اس بے انصافی اور تشدد کا جنم ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بڑی مشین آدمی کی تعمیر اور تخریب، دونوں کی، اچھائی اور برائی، دونوں کی قوتوں کو فروغ دیتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں، سرمایہ داری کے اقتصادی ڈھانچے کو بدل کر بڑی مشین کے غلط استعمال اور تشدد کو ختم کرنا ممکن ہے۔ بنیادی طور سے ذاتی جائداد اور سماج کی ملکیت پسندی سے مقابلے اور تشدد کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اشتراکی سماج کے تحت یہ لعنت ختم ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی مشین کی لائی ہوئی برکتیں ہمارے سلئے رہیں گی۔

میں یہ مانتا ہوں کہ بعض حالات میں لڑنا بھی پڑتا ہے۔ اس کا دارومدار منفرو صنے سے زیادہ عوام کے پس منظر پر ہوتا ہے۔ اس پر کہ وہ کیا کر سکتے ہیں، گاندھی جی تک نے، جو ایک بڑے اہنسا وادی ہیں، ہمیشہ یہ کہا ہے کہ لڑنا ڈرنے سے بہتر ہے۔ بھاگ جانے سے بہتر تشدد میں حصہ لینا ہے۔

نفرت اور تشدد کے جذبات ہمیں کمزور کرتے ہیں *

جو لوگ تشدّد کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اُنہیں جمہوریت میں یقین نہیں ہے۔

ہر مُلک میں قوم پرستی کا ایک مقام ہے اور اس کی پرورش کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کو جارحانہ بننے اور بین الاقوامی ترقی کی راہ میں روڑا بننے کی اجازت نہیں دینا چاہیئے۔

ایک ایسی دُنیا میں، جو روز بروز ایک اکائی کی طرف بڑھ رہی ہے قومی علیحدگی نہ تو پسندیدہ ہے اور نہ کوئی ممکن آدرش۔

قوم پرستی اپنی جگہ اچھی ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ اعتماد دولت اور خطرناک مورّخ ہے۔ یہ بہت سے واقعات کی طرف سے ہمیں نابینا رکھتی ہے اور کبھی کبھی صداقت کو مسخ کرتی ہے، خاص طور سے جب اس کا تعلق ہم سے، یا ہمارے مُلک سے ہو۔

ہر معاملے میں، وہ تعلیم ہو، سائنس، کلچر یا کچھ اور ہو، مجھے کوئی بات اتنی زیادہ ناپسند نہیں جتنی تنگ نظر قومیّت کا روّیہ۔ جس سے ہم یہ سوچنے لگیں کہ ہم فہم و دانش کی چوٹی پر پہنچ چکے ہیں اور اب ہمیں کچھ اور سیکھنے کی ضرورت نہیں۔

گو میں ہندوستانی قوم پرستی اور ہندوستانی آزادی کی حمایت کرتا ہوں، لیکن ایسا میں صحیح بین الاقوامیت کی بُنیاد پر کرتا ہوں۔

قوم کبھی نہیں مرتی۔ مرد اور عورتیں آتے جاتے ہیں۔ لیکن قوم ہمیشہ آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ خود میں ابدیت کی سی کوئی چیز رکھتی ہے۔

اپنے آپ کو علیحدہ کر لینا خطرناک بات ہے۔ خطرناک ایک فرد اور ایک قوم، دونوں کے لئے۔

کوئی فرد پوری طرح نسلی نظریے اور ثقافتی حدود سے چھٹکارا نہیں پا سکتا اور جب نسلوں اور ملکوں کے درمیان کش مکش ہو تو غیر جانب داری کی کوشش بھی اپنے عوام سے غدّاری سمجھی جاتی ہے۔ جنگ، جو اس کش مکش کی انتہائی شکل ہے، دشمن کے سلسلے میں تمام ایمان داری اور غیر جانب داری کو جان بوجھ کر بالائے طاق رکھ دیتی ہے۔ ذہن گھٹتا جاتا ہے اور ایک کے علاوہ اس کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت اپنے اعمال کو درست اور دشمن کے اعمال کو سیاہ ثابت کرنا ہو جاتا ہے۔ صداقت کہیں، سب سے گہرے کنویں کے تہ میں اپنا منہ چھپا لیتی ہے۔

اور جھوٹ برہنہ اور شرم کے شائبہ کے بغیر حکمرانی کرتا ہے۔

اس مُلک میں قوم پرستی کے نام پر (ماضی پرستی کا دَور) ترقی اور علم کی مخالفت کا رُجحان موجود ہے۔ ہم اکثر چھوٹی چھوٹی آرائش کی چیزوں کو ماضی کی عظیم چیزوں کی جگہ دے دیتے ہیں۔ اس طرح یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ عظیم چیزیں (بے توجہی کی وجہ سے) نقصان اُٹھاتی ہیں اور چھوٹی بے حقیقت نمائشی چیزوں کو فروغ مِلتا ہے لہٰذا ان معاملات میں ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ہندوستان نے، ماضی میں، چھوٹی باتوں میں اُلجھ کر کافی نقصان اُٹھایا ہے۔ ہندوستان، ایک غلام مُلک بنا، کیونکہ وُہ دُنیا کے ساتھ قدم نہ مِلا سکا۔ قوم پرستی ایک عظیم اور اہم قوّت ہے۔ اگر ہم اپنے عوام کی ذہانت کا کوئی حصہ چھوڑ دیں تو اس سے ہمیں بہت بڑا نقصان ہو گا۔ ہم (بے سہارا، بے بُنیاد اور) بغیر جڑ کے رہ جائیں گے۔ اسی کے ساتھ ساتھ قوم پرستی اکثر بہت سے گُناہوں اور ایسی چیزوں کی پردہ پوشی بھی کرتی ہے جو مر چکی ہیں۔

فن اپنے عہد کی زندگی اور تہذیب کا صحیح آئینہ ہے۔

ایک بڑے شہر میں آرٹ گیلریاں اور عجائب گھر، اُن کھڑکیوں

کی طرح ہوتے ہیں جن سے زندگی کی زیادہ وسیع، زیادہ بیش قیمت اور زیادہ گہری چیزیں نظر آتی ہیں۔

تعلیم کا مقصد ہوتا ہے انسان کے ذہن کو آزاد کرنا، نہ کہ اس کو بنے بنائے چوکھٹوں میں بند کرنا۔

عام طور سے میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ کلچر کے بارے میں سب سے زیادہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں، وہی کلچر سے عاری ہوتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کلچر چیختا نہیں ہے۔ کلچر خاموش، متین اور رواداد ہوتا ہے۔ آپ کسی کے کلچر کو اس کی خاموشی، اس کے انداز، اس کی گفتگو اور خاص طور سے اس کی زندگی سے پہچان سکتے ہیں۔

جب انسان فاقے کر رہے ہوں اور بھوک سے مر رہے ہوں۔ کلچر بلکہ خدا کی بھی بات کرنا بے وقوفی ہے۔ کسی اور چیز کے بارے میں بات کرنے سے پہلے، انسانوں کو معمول کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ضروری ہے۔ یہیں یہ اقتصادیات سامنے آتی ہے۔ آج کا انسان یہ تکلیفیں اور فاقہ کشی اور نابرابری برداشت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ بوجھ برابر، حصہ رسد، نہیں اُٹھایا جا رہا ہے۔

صرف سائنس ہی بھوک اور مفلسی، گندگی اور جہالت، توہمات اور جان لیوا رسم و رواج، ضائع ہونے والے عظیم وسائل اور فاقہ کش عوام سے بسے ہوئے مال دار ملک کے مسائل حل کر سکتی ہے۔

ایجاد علم کا جوہر ہے۔

اگر دُنیا کو اپنے مسائل حل کرنا ہیں تو ایسا ناگزیر طریقے سے سائنس کے ذریعے سے ہوگا۔ نا کہ سائنس کو ترک کر کے۔

میں ٹریڈ یونینوں کے حق میں ہوں۔ میں، اصولی طور پر مزدوروں کے ہڑتال کرنے کے حق کے حق میں ہوں۔ کیونکہ میں نے یورپ اور انگلینڈ کی مزدور تحریک کی ڈیڑھ سو سال کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہر (مِل) مالک کو اس بات کا احساس ہونا چاہیئے کہ کئی پشتوں سے مزدوروں کی زندگی کیسی سخت رہی ہے، کیسے اُنہیں کچلا گیا۔ کیسے اُنہیں چھوٹے سے چھوٹے جُرم میں عمر قید کی سزا بھگتنے آسٹریلیا بھیج دیا جاتا تھا۔ اور کس طرح رفتہ رفتہ باہمی اور مشترکہ کوششوں سے ٹریڈ یونینوں نے بتدریج —— میں مراعات نہیں کہہ سکتا —— معمول کے انسانی حقوق حاصل کیئے۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور ہڑتال کرنے کے حق کو اِتنا عزیز رکھتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ دُنیا کے مسئلوں اور ہندوستان کے مسئلوں کے حل کی ایک ہی کلید ہے۔ اور وُہ ہے اشتراکیت۔ اور جب میں یہ لفظ استعمال کرتا ہوں تو موہوم انسان پرستی کے طریقے سے نہیں بلکہ سائنسی اقتصادی لحاظ سے۔ اشتراکیت، ایک اقتصادی اصول سے زیادہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ زندگی کا ایک فلسفہ ہے اور اس حیثیت سے مجھے اچھی لگتی ہے۔ مُفلسی، وسیع بے روزگاری، ہندوستانی عوام کی غلامی اور پستی دُور کرنے کا کوئی اور راستہ اشتراکیت کے علاوہ مجھے نظر نہیں آتا۔

ناگزیر طریقے سے ہم ایک ہی ممکن حل کی طرف آتے ہیں —— ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی حدبندی میں اور پھر بالآخر ساری دُنیا میں، جس میں سب کی بھلائی کے لئے پیداوار اور دولت کی تقسیم پر پابندیاں ہوں گی۔ یہ کیسے کیا جائے گا، یہ دوسری بات ہے۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ ایک قوم یا بنی نوع انسان کی بھلائی کو اس لئے نہیں روکا جانا چاہیئے کہ وہ چند لوگ، جن کو موجودہ نظام سے فائدہ ہو رہا ہے، تغیّر پر معترض ہیں۔ اگر تبدیلی کی راہ میں سیاسی یا سماجی ادارے روڑا بنتے ہیں تو اُن کو ہٹانا ہوگا۔

مجھے صفائی کے ساتھ اس بات کا اقبال کرنا چاہیئے کہ میں ایک اشتراکی اور جمہوریت پسند ہوں اور بادشاہوں اور شہزادوں کو نہیں مانتا ہوں اور نہ اُس نظام کا قائل ہوں جو صنعت کے جدید بادشاہ پیدا کرتے ہیں۔ جنہیں پُرانے زمانے کے بادشاہوں سے زیادہ انسانوں کی زندگی اور تقدیر پر اختیار ہوتا ہے اور ان کے طریقے ایسے ہی لوٹ کھسوٹ کے ہیں جیسے پُرانے نوابوں اور امیروں کے ہوتے تھے۔

ہم آزادی کی بات کرتے ہیں۔ لیکن آج سیاسی آزادی ہمیں زیادہ دُور تک نہیں لے جاتی، تاوقتیکہ اقتصادی آزادی نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آدمی کے لئے جو فاقے سے ہو یا اُس مُلک کے لئے جو غریب ہو، آزادی نام کی کوئی چیز نہیں۔

آزادی، دوسروں کی آزادی کے احترام کا مطالبہ کرتی ہے۔

کوئی جمہوریت فقدان، مُفلسی اور نابرابری کے درمیان زیادہ دِنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی۔

آپ سَو طرح سے جمہوریت کی تعریف کر سکتے ہیں، لیکن یقیناً

اس کی ایک تعریف ہے قوم کی خود نظمی۔

جمہوریت کے کامیاب ہونے کے لئے باخبر رائے عامہ اور احساسِ ذمہ داری کا پس منظر ضروری ہے۔

آپ کے پاس بہت سے تحفے اور عطیے ہو سکتے ہیں۔ لیکن عوام کے پیار اور محبت سے زیادہ بیش قیمت کوئی چیز نہیں۔

ہمارے بہت سے سیاست داں، جو قانون میں ذی علم ہیں، دستور اور ایسی ہی چیزوں کے بارے میں سوچتے اور باتیں کرتے ہیں (اور) اُن انسانوں کو بھول جاتے ہیں جن کے لئے دستور اور قانون بنائے جاتے ہیں۔

امن کا فلسفہ ایشیا کا فلسفہ رہا ہے اور ہے۔

حقیقی عالمی نظام اور امن اُس وقت آئے گا جب اشتراکیت کا قیام عالمی سطح پہ ہوگا۔

یہ نہایت ہی بے ہودہ بات ہے کہ جائداد کو دیوتا بنا دیا جائے۔۔ بنی نوعِ انسان سے بھی بڑی اور مقدس کوئی چیز۔ یہ کہنا کہ انسان

چاہے جو کچھ بھی کرے ــــ وہ قتل تک کرے ــــ وہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن جائداد ایک دیوتا ہے اور اس کی پوجا ضرور ہونی چاہیئے۔ جائداد کا ایسا نظریہ ہے جس کو تسلیم کرنے کے لئے حکومت بالکل تیار نہیں ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ اشتراکیت کے تحت فرد کے لئے زیادہ آزادی کیوں نہیں ہوگی۔ درحقیقت اُس سے کہیں زیادہ آزادی ہوگی جو موجودہ نظام دیتا ہے۔ اس کو ضمیر اور ذہن کی آزادی، کام یہاں تک کہ محدود پیمانے پر ذاتی جائداد رکھنے کی آزادی ہوگی۔ سب سے زیادہ اس کو وہ آزادی ہوگی جو اقتصادی استقامت سے پیدا ہوتی ہے جو آج صرف تھوڑے سے لوگوں کو حاصل ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان اور دُنیا کو اسی سمت میں اشتراکیت کی طرف چلنا ہوگا۔ اگر دُنیا تباہ نہ ہوگئی۔

ہمارا آخری مقصد صرف بغیر طبقہ کا سماج ہو سکتا ہے جس میں مساوی معاشی انصاف ہو اور سب کے لئے مواقع ہوں۔ ایک سماج، جو منصوبہ بندی کے تحت منظم کیا گیا ہو، بنی نوع انسان کو زیادہ بلند مادی اور ثقافتی سطحوں تک لے جانے اور باہمی اشتراک، بے غرضی، خدمت کا جذبہ، صحیح کام کرنے کی خواہش، خیرسگالی اور محبت کی روحانی

اقدار کی تربیت ـــــ اور بالآخر ایک عالمی نظام کے قیام کے لئے۔ جو چیز بھی رُکاوٹ بنے' اس کو ہٹانا ہوگا۔ رسان سے' اگر ممکن ہو' زبردستی اگر ضروری ہو اور اس میں شک نہیں کہ طاقت کا استعمال اکثر ضروری ہوگا۔

تاریخی تاریخیں

شاہد کمال

۱۸۸۹ء

۱۴- نومبر کو الہ آباد (یو، پی) میں پیدا ہوئے۔

۱۹۰۵ء

مئی میں تعلیم کے لئے Harrow روانہ ہوئے۔

۱۹۰۷ء

ٹرنٹی کالج، کیمبرج میں داخل ہوئے۔

۱۹۰۹ء

جرمنی اور فرانس گئے۔

۱۹۱۰ء

اعزاز کے ساتھ قدرتی علوم (Natural Sciences)
میں ڈگری حاصل کی۔
مضامین: کیمیا، جیالوجی اور نباتات۔

۱۹۱۲ء

انر ٹمپل میں بیرسٹر ہوئے۔
ہندوستان واپس آئے۔
الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی۔
کانگرس کے بانکی پور کے اجلاس میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے

۱۹۱۳ء

یو، پی کی کانگرس تنظیم میں شامل ہوئے۔

۱۹۱۵ء

الہ آباد میں پہلی بار عام جلسے سے خطاب کیا جو اخباروں پر پابندیاں عائد کرنے والے نئے قانون کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے ہوا تھا۔

۱۹۱۶ء

فروری میں کملا کول سے شادی ہوئی۔
لکھنؤ میں، کانگرس کے اجلاس میں پہلی بار گاندھی جی سے ملے۔

۱۹۱۷ء

ہوم رُول کی تحریک میں شامل ہوئے۔
۱۹ نومبر کو بیٹی (اندرا) پیدا ہوئی

۱۹۱۸ء

کُل ہند کانگرس کمیٹی کے رُکن ہوئے۔

۱۹۱۹ء

پنجاب میں گڑبڑ کی تحقیقات میں سی، آر داس کے معاون ہوئے۔

۱۹۲۱ء

۶ دسمبر کو پرنس آف ویلز کی آمد کے سلسلے میں ہڑتال کے لئے اشتہار تقسیم کرنے کے "جرم" میں پہلی بار قید ہوئے۔

۱۹۲۲ء

۳ مارچ کو جیل سے رہا ہوئے۔

۲۲ دسمبر کو نابھ جیل میں قید کئے گئے کیونکہ انہوں نے ریاست سے باہر نکل جانے کے ریذیڈنٹ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔

۴۔ اکتوبر کو جیل سے رہا ہوئے۔

الہ آباد میونسپل کمیٹی کے چیرمین چنے گئے۔

کوکوناڈا کے اجلاس میں انڈین نیشنل کانگریس کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے (دوسری بار ۲۹ — ۱۹۲۷ء میں)

۱۹۲۵ء

الہ آباد میونسپلٹی کے چیرمین کے عہدے سے مستعفی ہوئے۔

کملا نہرو سخت بیمار ہوئیں۔

۱۹۲۶ء

مارچ میں کملا کو علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ لے گئے۔

اٹلی، فرانس، جرمنی، بلجیم اور روس گئے۔

۱۹۲۷ء

فروری میں انڈین نیشنل کانگرس کے سرکاری ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے برسلز میں محکوم اور مظلوم قوموں کی کانگرس میں شرکت کی۔

یورپ سے واپس آئے۔

اکتوبر میں مدراس کے اجلاس میں انہیں کی کوششوں سے انڈین نیشنل کانگرس نے آزادی کی منزل کو اپنایا۔

۱۹۲۸ء

۲۹ نومبر کو لکھنؤ میں سائمن کمیشن کے خلاف ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے پولیس کی لاٹھیوں کا نشانہ بنے۔

آزادیٔ ہند لیگ قائم کی جس نے برطانیہ کے ساتھ سارے ناطے توڑنے کا پرچار کیا۔ اس تنظیم کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔

۱۹۲۹ء

کُل ہند کانگرس کمیٹی سے اشتراکی پروگرام منوایا۔

کانگرس کے لاہور اجلاس کی صدارت کی اور اسی اجلاس میں کانگرس نے مکمل آزادی کو اپنا مقصد قرار دیا۔

کُل ہند ٹریڈ یونین کے ناگپور کے اجلاس کی صدارت کی۔

میرٹھ سازش کیس میں ماخوذ قیدیوں کے مقدمے کے لئے چندہ جمع کیا۔

کتاب Letters from a father to his daughter (بیٹی کے نام باپ کے خطوط) شائع ہوئی۔

۱۹۳۰ء

نمک ستیہ گرہ میں کام کرنے کے "جرم" میں ۱۴۔ اپریل کو گرفتار کئے گئے اور چھ مہینے قید کی سزا ہوئی۔

۱۱۔ اکتوبر کو نینی تال جیل سے رہا ہوئے۔

الہ آباد میں کسانوں کی ایک کانفرنس میں شرکت کے "جرم" میں پھر گرفتار کئے گئے اور دو برس کی قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی (۲۹ اکتوبر)

۱۹۳۱ء

۲۶ جنوری کو جیل سے رہا ہوئے۔

۶ فروری کو موتی لال نہرو سرگباش ہوئے۔

الہ آباد نہ چھوڑنے کے حکم کی خلاف ورزی کے "جرم" میں گرفتار کئے گئے اور ۲ دو برس کی قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی (۲۶ دسمبر)

۱۹۳۳ء

۱۱۔ اگست کو والدہ کی علالت کی وجہ سے جیل سے رہا کئے گئے۔

۱۹۳۴ء

جنوری میں زلزلے سے تباہ شدہ بہار کے علاقوں کا دورہ کیا اور مصیبت زدگان کی امداد کے لئے کام کیا۔

کلکتہ کی تقریروں میں حکومت کی "مذمت اور توہین" کرنے کے جرم میں الہ آباد میں گرفتار کئے گئے اور دو برس کی قید کی سزا ہوئی (۱۶ فروری)

۱۱- اگست کو شدید طور پر بیمار کملا نہرو سے ملنے کے لئے رہا کئے گئے۔ لیکن دس روز بعد حکومت کے خلاف تقریریں کرنے کے "جرم" میں پھر قید ہوئے۔

کتاب "Glimpses of World History" (تاریخِ عالم کی جھلکیاں) شائع ہوئی۔

۱۹۳۵ء

۱۴ فروری کو الموڑہ جیل میں خود نوشت سوانح حیات (میری کہانی) مکمل کی۔

کملا نہرو کی نازک حالت کے پیشِ نظر رہا کئے گئے (۴ ستمبر) اور کملا کو دیکھنے ہوائی جہاز سے یورپ گئے۔

۱۹۳۶ء

۲۸ فروری کو کملا نہرو سرگباش ہوئیں۔

لندن اور روم گئے۔

۲۳- اپریل کو لکھنؤ میں کانگرس کے ۴۹ ویں اجلاس کی صدارت کی

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت کانگرس کے انتخابات لڑنے کی بات مان لی، لیکن عہدے قبول کرنے کی مخالفت کی۔

ہندوستانی شہری آزادیوں کی یونین قائم کی۔ اس کا دستور مرتب کیا اور اس کے کام میں سرگرم حصہ لیا۔ (۲ جون)

انتخابی مہم کے سلسلے میں مُلک کا دورہ کیا۔
۲۶ دسمبر کو کانگرس کے فیض پور اجلاس کی صدارت کی۔

۱۹۳۸ء

والدہ سروپ رانی سرگباش ہوئیں۔
قومی پلاننگ کمیٹی کے چیئرمین ہوئے۔
خانہ جنگی کے زمانے میں اسپین گئے۔

۱۹۳۹ء

چین گئے۔

۱۹۴۰ء

انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک کے دوران میں گرفتار ہوئے۔
(۳۱ر اکتوبر) اور چار برس قیدِ با مشقّت کی سزا ہوئی۔

۱۹۴۱ء

دسمبر میں جیل سے رہا ہوئے۔

۱۹۴۲ء

ہندوستان آئے ہوئے چیانگ کائی شیک سے تبادلۂ خیال ہوا۔
ہندوستان کے "معاملات" طے کرنے کے لئے سر سٹیفورڈ کرپس
نے جو گفت و شنید شروع کی، اس میں حصہ لیا۔
آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں شہرہ آفاق "ہندوستان چھوڑدو"

قرار داد پیش کی۔
گاندھی جی اور کانگریس مجلسِ عمل کے اراکین کے ساتھ گرفتار ہوئے اور احمد نگر کے قلعے میں نظر بند کئے گئے (۸۔ اگست)

۱۹۴۴ء

۱۳۔ اپریل کو کتاب Discovery of India (تلاشِ ہند) لکھنا شروع کی۔

۱۹۴۵ء

۱۵ جنوری کو قید سے رہا کئے گئے۔
برطانیہ سے "ہند کے معاملات طے کرنے" کی شملہ گفت و شنید میں شرکت کی (۲۵ر جون)
ہندوستانی قومی فوج (INA) کے افسروں اور جوانوں کی قانونی صفائی کے لئے امداد منظّم کی۔

۱۹۴۶ء

مارچ میں کتاب Discovery of India شائع ہوئی۔
جنوب مشرقی ایشیا کا دورہ کیا۔
عبوری حکومت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے وائسرائے کی دعوت قبول کی۔ (۱۷ر اگست)
اس حکومت کے نائب صدر اور وزیر خارجہ کے عہدے کا حلف

اُٹھایا (۲ ستمبر)
اکتوبر میں شمالی مغربی سرحدی صوبے کا دَورہ کیا۔
دسمبر میں کیبنٹ مِشن پلان کی تجویزوں کی بعض وضاحتوں پر برطانوی حکومت سے گفتگو کرنے لندن گئے۔
۳۰ دسمبر کو آئین ساز اسمبلی میں مقاصد کی قرارداد پیش کی۔

۱۹۴۷ء

۳ جنوری کو دِلّی میں ہندوستانی سائنس کانگرس کی صدارت کی۔
۲۳ مارچ کو نئی دِلّی میں ایشیائی تعلقات کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔
۱۵ راگست کو آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم ہوئے۔
۲۱ راگست کو مسٹر لیاقت علی خان اور سردار پٹیل کے ساتھ پنجاب کے فساد زدہ علاقوں کا دَورہ کیا۔

۱۹۴۸ء

۱۷ فروری کو آئین ساز اسمبلی میں ہندوستان کی نئی ناطرف داری کے اصول پر مبنی خارجہ پالیسی کی وضاحت کی۔
۱۲- اپریل کو ہیرا کُڈ باندھ کا سنگِ بُنیاد رکھا۔
۲ جون کو اوٹاکمنڈ میں ایشیا اور دُور مشرق کے لئے اقوام متحدہ کے اقتصادی کمیشن کے تیسرے اجلاس کا افتتاح کیا۔

۲۰ ر اگست کو ایٹمی توانائی کمیشن کی پہلی میٹنگ سے خطاب کیا۔

۴۔ اکتوبر کو جنوب مشرقی ایشیا کے لئے عالمی صحت ادارے کی علاقائی کمیٹی کی پہلی میٹنگ کا افتتاح کیا۔

۶ ر اکتوبر کو لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی اور اس میں دولت مشترکہ میں ہندوستان کی رکنیت جاری رکھنے کے لئے بنیاد طے ہوئی۔

۳ ر نومبر کو پیرس میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خاص اجلاس سے خطاب کیا۔

۱۰ ر نومبر کو نئی دلّی میں موسمیات سے متعلق بین الاقوامی ادارے کی علاقائی کانفرنس کا افتتاح کیا۔

۲۳ ر دسمبر کو نئی دلّی میں ہندوستانی تاریخی دستاویزات کمیشن کے سلور جوبلی اجلاس کا افتتاح کیا۔

۱۹۴۹ ر

۲۰ جنوری کو انڈونیشیا میں ڈچ جارحیت کی مذمت کرنے کے لئے ۱۹۔ ایشیائی قوموں کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔

۱۹۔ اپریل کو دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی۔

۲۴ ستمبر کو جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے لئے پاکستان کو

دعوت دی۔

۷ر اکتوبر کو امریکہ کے دورے کے لئے روانہ ہوئے۔
اقوام متحدہ کی کانگرس سے خطاب کیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی
کی ٹرسٹی شپ کمیٹی سے بھی خطاب کیا۔ (۱۹۔ اکتوبر)
کینیڈا گئے اور وہاں کی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں سے
خطاب کیا۔ (۲۴ر اکتوبر)
۶ر نومبر کو نیگرو کاز کی خدمت کے لئے امریکی "اسپیر گارن"
تمغہ دیا گیا۔

۱۹۵۰ء

۱۲ر جنوری کو کولمبو میں سیلون یونیورسٹی کے تقسیمِ اسناد کے
سالانہ جلسے سے خطاب کیا۔
۱۹ر جنوری کو نئی دِلّی میں قومی اسٹیڈیم کامنگ بُنیاد رکھا۔
۲۸ جنوری کو ہندوستان کی سُپریم کورٹ کا افتتاح کیا۔
مارچ میں منصوبہ بندی کمیشن وجود میں آیا۔ آپ اس کے
چیئرمین مقرر ہوئے۔
پاکستان کے وزیر اعظم کا خیر مقدم کیا اور اقلیتوں کے بارے
میں نہرو لیاقت پیکٹ پر دستخط کئے۔
۱۹۔ اپریل کو نئی دِلّی میں ثقافتی تعلقات سے متعلق ہندوستانی

کونسل کا افتتاح کیا۔

۲۶۔ اپریل کو حکومتِ پاکستان کی دعوت پر کراچی گئے۔

۱۴ جولائی کو دُنیا کی تین بڑی طاقتوں سے کوریا کی جنگ جلد سے جلد بند کرنے کی اپیل کی۔

۲۰ر اکتوبر کو نئی دِلّی میں سپریم کورٹ ہاؤس کا سنگِ بنیاد رکھا۔

۱۹۵۱ء

قاہرہ، جینوا، لندن اور پیرس گئے۔

۱۱ر جون کو نیپال کے سرکاری دَورے پر گئے۔

۹ر ستمبر کو کُل ہند نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔

۱۸۔ اکتوبر کو دِلّی میں کانگریس کے ۵۷ ویں اجلاس کی صدارت کی۔

۵ دسمبر کو اعداد وشمار سے متعلق بین الاقوامی کانفرنس سے خطاب کیا۔

۱۶ دسمبر کو حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم کا افتتاح کیا۔

۱۹۵۲ء

۲۵ فروری کو ہند اور شام کے سمجھوتے پر دستخط کئے۔

۲۹ مارچ کو نئی دلّی میں ہندوستانی صنعت اور تجارت کے چیمبروں کی فیڈریشن کے سلور جوبلی اجلاس کا افتتاح کیا۔

سانچی میں بودھوں کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۵۳ء

۹ جنوری کو نئی دِلّی میں عالمی گاندھی وادی سمینار میں شرکت کی۔

۱۷-۱۸ جنوری کو کانگرس کے حیدر آباد اجلاس کی صدارت کی۔

۲۸ مئی کو ملکہ الزبتھ کی تاجپوشی کی تقریبات میں شرکت کی۔

۲۵ جولائی کو حکومت پاکستان کی دعوت پر کراچی گئے۔

یکم اگست کو قومیائی ہوئی فضائی کارپوریشن کا افتتاح کیا۔

۱۳ اکتوبر کو نئی دِلّی میں کولمبو پلان کی مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ کا افتتاح کیا۔

۱۹۵۴ء

۱۵ جنوری کو لنکا کے وزیر اعظم مسٹر جان کوٹیلاوالا کا خیر مقدم کیا۔

۲۹ مارچ کو نئی دِلّی میں پبلک ایڈمنسٹریشن کے انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا۔

۲۷ اپریل سے ۳ مئی تک لنکا کے ایک ہفتے کے دورے پر گئے۔

۲۵ جون کو چینی وزیر اعظم مسٹر چو این لائی کا خیر مقدم کیا۔ بقائے باہم کے پانچ اصولوں (پنچ شیل) پر مبنی مشترکہ اعلان جاری کیا۔

اکتوبر میں چین گئے۔

۱۷- دسمبر کو یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کا خیر مقدم کیا۔

برما، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ملایا کا دورہ کیا۔

۱۹۵۵ء

۳ جنوری کو نئی دلّی میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاگ ہمرشولڈ کا خیر مقدم کیا۔

جنوری اور فروری میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی اور ملکہ الزبتھ سے ملنے گئے۔

۱۷ مارچ کو شہزادہ نوروڈام سی ہانک اور لنگ نیلگتھ سے ملے جو نئی دلّی آئے۔

۲۵ مارچ کو برما کے وزیر اعظم اُو نو کا خیر مقدم کیا۔

۱۳- اپریل کو مصر کے وزیر اعظم ناصر اور ان کے ساتھیوں سے ملے۔

۲۵ ر اپریل کو بانڈونگ میں افریشیائی مُلکوں کی کانفرنس میں شرکت کی۔

۲ مئی کو نئی دِلّی میں سعودی عرب کے وزیر اعظم شہزادہ امیر فیصل کا استقبال کیا۔

۱۲ مئی کو نئی دِلّی میں قومی عجائب گھر کا سنگِ بُنیاد رکھا۔

۱۴ مئی سے ۱۸ مئی تک پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی اور وزیر داخلہ میجر جنرل اسکندر مرزا سے گفت و شنید کی۔

۵ جون کو سوویت یونین، یوگوسلاویہ، چیکوسلاواکیہ، آسٹریا
اٹلی اور مصر کے دورے پر روانہ ہوئے۔

۱۵ جولائی کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے "بھارت رتن"
کا اعزاز بخشا۔

۱۹ جولائی کو انڈونیشیا کے صدر سوکارنو سے ملے۔

۲۱ ستمبر کو لاؤس کے وزیر اعظم اور ولی عہد کے ساتھ ایک مشترکہ
اعلان پر دستخط کئے جس میں لاؤس سے متعلق جنیوا سمجھوتے
پر عمل کرنے پر زور دیا گیا تھا۔

۶ اکتوبر کو بنگلور میں ہندوستان مشین ٹولز فیکٹری کا افتتاح
کیا۔

۱۸ نومبر کو روسی وزیر اعظم مارشل بُلگانن اور روسی کمیونسٹ
پارٹی کے اوّل سیکرٹری نکیتا خروشچوف کا ہندوستان آنے
پر خیر مقدم کیا۔

۲۸ نومبر کو سعودی عرب کے شاہ سعود کا ہندوستان میں استقبال
کیا۔

۱۰ دسمبر کو ناگ ارجن ساگر پروجیکٹ کا سنگِ بنیاد رکھا۔

۱۹۵۶ء

برطانوی وزیر خارجہ سیل وِن لائڈ، امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ

جان فاسٹر ڈلس، فرانسیسی وزیر خارجہ کرسچن پی نو اور روس کے پہلے نائب وزیر اعظم میکویان سے ملاقاتیں کیں۔

(مارچ)

۲۸۔ اپریل کو بمبئی میں ایٹمی ری ایکٹر نصب کرنے کے لئے کینیڈا کے ساتھ معاہدے پر دستخط کئے۔

۲۷ جون سے ۶ جولائی تک لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی اور اس کے بعد آئرلینڈ، مغربی جرمنی، فرانس، یوگوسلاویہ، یونان، مصر، شام اور لبنان کا دورہ کیا۔

۱۸ سے ۲۰ جولائی تک برونی میں صدر ناصر اور صدر ٹیٹو سے مذاکرات

۲۳ جولائی کو وقتی طور سے خزانہ کی وزارت کا قلمدان سنبھالا۔

۲۳ / جولائی کو سوئیز کا سوال طاقت سے حل کرنے کے خلاف تنبیہہ کی۔

۳۱ / اکتوبر کو مصر پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی مشترکہ جارحیت کے خلاف اقدام کرنے کے لئے اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کو پیغام بھیجا۔

۱۸ / اگست کو انجار (سوراشٹر) میں جیپ کا حادثہ پیش آیا۔

۵ نومبر کو دِلّی میں UNESCO کی نویں کانفرنس کے ڈیلی گیٹوں سے خطاب کیا۔

۱۲ سے ۱۴ نومبر تک نئی دِلّی میں کولمبو طاقتوں کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں حصہ لیا۔ یہ کانفرنس مصر کی صورت حال پر غور کرنے کے لئے بلائی گئی تھی۔

نئی دِلّی میں چینی وزیر اعظم چو این لائی سے چینی بھارتی سرحد کے سوال پر گفتگو کی اور چینی وزیر اعظم نے میک ماہن لائن کو دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کے طور پر تسلیم کر لیا۔ (۲۸ نومبر)

۲۰ دسمبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ممبروں کی ایک غیر رسمی میٹنگ سے خطاب کیا۔

چینی وزیر اعظم چو این لائی سے، جو ہندوستان آئے ہوئے تھے چین اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان اختلافی امور پر بات چیت کی۔ (۳۰ دسمبر ۱۹۵۶ء سے ۲ جنوری ۱۹۵۷ء تک)

۱۹۵۷ء

۱۲ جنوری کو حضرت گوتم بدھ کے مہا پری نروان کی ڈھائی ہزارویں سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لئے دلائی لامہ اور پنچن لامہ کے ساتھ نالندہ گئے۔

۱۳ جنوری کو اڑیسہ میں ہیرا کد پروجیکٹ کا افتتاح کیا۔

۲۸ جنوری کو ٹرامبے میں ایشیا کے پہلے ایٹمی ری ایکٹر کا افتتاح کیا۔

شام کے صدر شکری القوت علی سے بات چیت کی۔

۲۵ جنوری کو سوویت وزیرِ دفاع مارشل ژوکاف سے گفتگو کی۔

۳۰ جنوری کو عارضی طور سے دفاع کا قلمدانِ وزارت سنبھالا۔

۱۷۔ اپریل کو نئی کابینہ نے نہرو کی سربراہی میں حلف اُٹھایا۔

جون میں شام، ڈنمارک، فن لینڈ، ناروے اور سویڈن کے خیر سگالی کے دَورے پر گئے۔

جولائی میں ہالینڈ، مصر اور سوڈان گئے۔

۲۰ اور ۲۱ ستمبر کو یل وال میں بھوداں کانفرنس میں شرکت کی۔

۹ سے ۱۳ اکتوبر تک جاپان کا دَورہ کیا۔

۲ دسمبر کو نئی دلّی میں دولت مشترکہ کی پارلیمانی کانفرنس سے خطاب کیا۔

۱۹۶۰ء

اپریل میں نئی دلّی آئے ہوئے چینی وزیر اعظم چو این لائی سے ملے اور یہ فیصلہ کیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان سرحد کے بارے میں اختلافی امور کی سرکاری سطح پر جانچ کی جائے اور دونوں ملکوں کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

مئی میں لندن گئے اور دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کے بعد پیرس، مصر، ترکی اور لبنان بھی گئے۔

۱۹ ستمبر کو پاکستان کے ساتھ سندھ کے پانی کے معاہدے پر دستخط کئے۔

ستمبر اکتوبر میں ہندوستانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سربراہوں کے اجلاس میں شرکت کی اور امریکہ اور روس کے درمیان رابطوں کی تجدید پر زور دیا۔

مدراس پردیش میں کندہ پن بجلی پر وجکٹ کا افتتاح کیا۔

۱۹۶۱ء

مہاراشٹر اور گجرات پردیشوں کا افتتاح کیا

پیرس گئے۔

جنوبی افریقہ میں شارپے ویل اور لنگا کے قتلِ عام کی مذمت کی۔

ترکی، مصر، لبنان، شام اور مغربی پاکستان کا دورہ کیا۔

پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان سے بات چیت کی۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا اور عالمی امن کی ضرورت پر زور دیا۔

۱۶ جنوری کو بمبئی میں کنیڈا، بھارت ایٹمی بھٹی کی رسم افتتاح انجام دی۔

۱۸ جنوری کو نئی دِلّی میں ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ بھارت کو اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں کہ چین نے بھارت کی شمالی سرحدوں پر جارحیّت کی ہے اور پاکستان کا چین سے کشمیر کے علاقوں میں سرحدبندی کی گفت وشنید کرنا یقیناً غلط بات ہے۔

۷ فروری کو نئی دلّی میں عالمی صحت ادارے کے اجلاس کا افتتاح کیا۔

۸ سے ۱۳ فروری کے عرصے میں مہاراجہ بھوٹان سے گفتگو کی۔

مارچ میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی۔

ستمبر میں بلگراڈ میں ناطرف دار ملکوں کی کانفرنس میں شرکت کی۔

۸ دسمبر کو ملایا کے حکمرانِ اعلیٰ سے مُلاقات کی۔

۹ دسمبر کو نئی دِلّی میں پہلی ایشیائی تاریخ کانگرس کا افتتاح کیا۔

۱۰ دسمبر کو بھاکڑہ بجلی گھر کا افتتاح کیا۔

۱۳ دسمبر کو سوویت روس کے صدر بریزنیف سے ملے۔

۱۹۶۲ء

یکم جنوری کو آسام میں نون متی کے تیل صاف کرنے کے کارخانے

کا افتتاح کیا۔

۳ جنوری کو بھارتی سائنس کانگرس کے ۴۹ ویں اجلاس کا افتتاح کیا۔

۱۱ر جنوری کو برما کے وزیر اعظم اُونو سے مُلاقات کی۔

۱۱ر جنوری کو ہی دولت مشترکہ کی تعلیمی کانفرنس کا افتتاح کیا۔

۱۸ جنوری کو ڈنمارک کے صدر کیمپ مین سے مُلاقات کی۔

۲۴ جنوری کو ہندوستان میں بنی ہوئی پہلی نسّان پیڑ گاڑی کا افتتاح کیا۔

۲۴ جنوری کو متحدہ عرب جمہوریہ کے نائب صدر عامر سے ملے۔

۱۰ر اپریل کو تیسرے عام انتخابات کے بعد نئی نہرو کابینہ نے حلفِ وفاداری اُٹھایا۔

۱۸۔ اپریل کو نیپال کے شاہ مہندر سے ملے۔

۲۔۳ جون کو قومی یک جہتی کونسل کے جلسے کی صدارت کی۔

ستمبر میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کے بعد پیرس اور قاہرہ بھی گئے۔

۲۱ ستمبر کو پیرس میں UNESCO سے خطاب کیا۔

۱۷۔ اکتوبر کو رومانیہ کی عوامی جمہوریہ کی راجیہ سبھا کے صدر کا خیر مقدم کیا۔

متحد ہو کر چینی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے قوم سے اپیل کی۔

۲۷ر اکتوبر کو چینی وزیراعظم کو ایک مراسلے میں لکھا کہ چینی فوجیں ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء کی پوزیشن تک واپس جائیں۔ اس کے بعد کوئی بات چیت ہو سکتی ہے۔

۲۶/۲۷۔ اکتوبر کو مختلف مُلکوں کی حکومتوں کے سربراہوں کو خط بھیجے جن میں بھارتی علاقوں میں چینی جارحیت سے پیدا ہونے والی صورتِ حال بتائی گئی تھی۔

۲۷ر اکتوبر کو ملایا کے وزیراعظم ٹنکو عبدالرحمٰن کا استقبال کیا اور اُن سے بات چیت کی۔

۳۱ر اکتوبر کو قبرص کے صدر آرک بشپ میکاریوس کا استقبال کیا۔

یکم نومبر کو عارضی طور سے دفاع کا قلمدانِ وزارت سنبھالا۔

۳۰ نومبر کو پاکستان کے صدر ایوُب خان کے ساتھ مشترکہ اعلان جاری کیا جس میں بھارت اور پاکستان کے اختلافات باہمی گفت و شنید سے طے کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا۔

۱۹۶۳ء

چینی بھارتی سرحد کے جھگڑے کو طے کرنے کے لئے کولمبو تجویزوں کے بارے میں لنکا کی وزیراعظم مسز بھنڈارنائک، متحدہ عرب

جمہوریہ کے مسٹر علی صابری اور گھانا کے مسٹر اسلنتے سے بات چیت
کی (جنوری ۱۰ — ۱۳)
۱۵ر جنوری کو لبنان کے وزیرِ اعظم رشید کرامی کا خیر مقدم کیا۔
۲۳ جنوری کو لوک سبھا میں کولمبو تجویزیں قبول کرنے کے لئے
قرارداد پیش کی۔
۲۶ جنوری کو دیہی رضاکار فورس کا افتتاح کیا۔
۲۸ جنوری کو کمبوڈیا کے شہزادہ سی ہانک کا خیر مقدم کیا۔
فروری میں دِلّی کے نزدیک لداخ وِہارا کا افتتاح کیا۔
اکتوبر میں اقوامِ متحدہ نے شری نہرو کی یہ تجویز قبول کی کہ ۱۹۶۵ء
کو بین الاقوامی اشتراک کے سال کی حیثیت دی جائے۔
اکتوبر میں بھاکڑہ باندھ کا قوم کے نام انتساب کیا۔
نومبر میں لاؤس کے وزیرِ اعظم سے دِلّی میں مِلے۔
نومبر میں افریقی مُلکوں میں سفیروں کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔
نومبر میں چترنجن میں پہلے بجلی کے انجن کے افتتاح کیا۔
دسمبر میں اُردن کے شاہ حُسین، جواہر لال نہرو سے مِلے۔

۱۹۶۴ء

جنوری میں اُڑیسہ کے ٹکرپاڑا باندھ پروجکٹ کا سنگِ بُنیاد رکھا۔
جنوری میں کانگرس کے بھونیشور اجلاس میں شرکت کرنے گئے

اور وہیں فالج کا اثر ہوا۔

فروری میں برمی انقلابی کونسل کے چیئرمین جنرل نے وِن اور سنگاپور کے وزیراعظم لی کوان یُو، جواہر لال نہرو سے ملے۔

مئی میں کوسی اور گنڈک پر وجکٹوں کی نیو رکھنے کے موقعہ پر نیپال کے شاہ مہندر سے ملے۔

۲۳ سے ۲۶ مئی تک آرام کے لئے ڈیرہ دون گئے۔

۲۷ مئی کو زندگی کا دیا بجھ گیا۔

اگر ایک بار پھر مجھے گزری ہوئی زندگی گزارنے کا موقع مل جائے اور میری موجودہ معلومات اور تجربے میرے رفیقِ سفر رہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کروں گا۔ میں۔ میں نے پچھلی زندگی جس طرح گزاری ہے، اس میں بہت سی اچھی تبدیلیاں کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن پبلک زندگی میں میرے بڑے بڑے فیصلے اٹل رہیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ان فیصلوں کو بدل بھی نہیں سکتا۔ کیوں کہ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور تھے کوئی طاقت تھی میرے قابو سے باہر جو مجھے ان فیصلوں کی طرف ڈھکیلتی رہتی تھی۔

جواہر لال نہرو

خواہ آپ کے پاس بہت سے تحفے تحائف ہوں
لیکن عوام کی محبت و شفقت سے زیادہ بیش قیمت
اور کوئی چیز نہیں۔

جواہر لال نہرو

ہر ملک میں قوم پرستی کا ایک مخصوص مقام ہوتا
ہے اور اسے فروغ بھی ملنا چاہیئے۔ اسے جارحانہ نوعیت
اختیار کر کے بین الاقوامی ترقی کے راستے میں رکاوٹ
پیدا کرنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔

جواہر لال نہرو

میں سمجھتا ہوں کہ بہت ہی کم لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تشدد کا زمانہ گزر گیا یا جلد ہی ختم ہونے والا ہے، آج تشدد جس شدت سے اور جس قدر تباہ کن اور غیر انسانی صورت میں جلوہ گر ہے اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا۔ یا تو یہ خود ختم ہو جائے گا یا دنیا کے بہت بڑے حصے کی ہلاکت کا موجب بنے گا۔ ہمیشہ بے وقوف لوگ اپنی حماقت کی پردہ پوشی کے لئے تلوار کا سہارا لیا کرتے ہیں۔

جواہر لال نہرو

وہ فخرِ ہند و نازشِ عالم گزر گیا
انسانیت کا محسنِ اعظم گزر گیا

ہر قوم کا نشان ہوا آج سرنگوں
اُونچا تھا جس سے ہند کا پرچم گزر گیا

جس کی ہر ایک بات میں تھا خندۂ بہار
اس عہد کا وہ خلقِ مجسم گزر گیا۔

ہے سوگوار دانش و علم و عمل کی بزم
اس دور کا مفکرِ اعظم گزر گیا

یہ کتاب بیگم شاہدہ کمال نے کوہِ نور پریس
سے چھپوا کر ریذیڈنسی روڈ سری نگر کشمیر سے شایع کی۔